(از)
محمد حمید اللہ

سلطنتوں کے باہمی برتاؤ کا دستور العمل

(یعنی)

قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں

(از)

محمد حمید اللہ

ایم، اے۔ ایل، ایل، بی (عثمانیہ) ڈی، فل (بون جرمنی) ڈی لٹ (پیرس) وغیرہ

لکچرار قانون بین الممالک (جامعہ عثمانیہ)

سابق اعزازی ریڈر بون یونیورسٹی (جرمنی)

سنہ ۱۳۵۵ ہجری — [illegible] فصلی

طابع ناشر فروشندہ

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

قیمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

مضمون	فقرہ نشان
پیش لفظ	ابتدا
املا و اعراب	ابتدا

(۱) مبادی

تمہید

(ب) مقاصد

۱۔ مسالمانہ تعلقات

(۲) مخاصمانہ تعلقات

(۳) غیر جانبداری

خاتمۃ الکتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِملا اور اِعرا

باوجود بہت سی خامیوں کے واقعہ یہ ہے کہ ہماری زبان کا رسم الخط لاطینی، یونانی، روسی، دیوناگری، چینی، جاپانی سب خطوں سے زیادہ جامع ہے (خاص کر انگریزی اِملا اور تلفّظ کی بے اصولیوں سے کون واقف نہیں)۔ ہمارے اسلاف نے عربی خط میں پ چ ژ گ ٹ ڈ ڑ بڑھالئے تھے اور ن ں، ی ے ـہ ھـ میں فرق کر لیا تھا۔ چند ایک اور اضافوں سے ہمارا خط جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی کا تلفّظ بہت اچھی طرح ادا کر سکتا ہے:۔

موجودہ:
- ٍ ٓ ْ ّ تنوین، مد، جزم اور تشدید
- ـنٛـ نون غنہ لفظ کے بیچ میں ہو تو الٹا جزم
- ـِ ـَ ـُ معروف زیر، زبر اور پیش
- وٗ ـے صرف زبر اور جزم کے بعد واو معروف پر الٹا پیش اور یائے

موجودہ	ے	معروف کے نقطوں کے نیچے کھڑی لکیر کھینچی جاتی ہے
	ے	مجہول زبر، زیر اور پیش۔
مجوزہ	ق	قے اور واؤ کے بین بین آواز انگریزی اور فرانسیسی (V) اور جرمن (W) کے لئے۔
	ۉ	واؤ معروف اور یائے معروف کے بین بین آواز فرانسیسی (u) اور جرمن (ü) کے لئے۔
	ۂ	الف اور واؤ مجہول کے بین بین، انگریزی (o) کے لئے۔
	ش ۺ	اُلٹے نقطوں والی شین کی آواز نرم تر ہوتی ہے اور جرمن (ch یا ch) کے لئے۔

مثلاً دُود دُہنے وقت ایک تھن خالی ہونے پر دُوسرا نچوڑا جاتا ہے نہ کہ دونوں ایک ساتھ۔

مونٹس کیو فرانس کا ایک مشہور سیاست دان گزرا ہے۔

جرمن جنرل بلوچر کی مدد کے بغیر ولنگٹن جیت نہ سکتا۔

انگریزی زبان میں آٹ اور آن اور آف کے بہت سے معنے ہیں۔ لُوفر کا عجائب خانہ — کَف کے معنے ہیں محبت — اِنٹر نانشنل کا ہماری زبان کے لئے ایک نیا تلفظ ہے ....

پیش لفظ

اس کتاب کا موضوع ہمارے ملک کے لئے تو نہیں البتہ ہماری زبان
کے لئے بالکل نیا ہے۔ اس پر کوئی کتاب ہی نہیں، کوئی مضمون تک ہندوستانی
زبان میں میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس سال جامعہ عثمانیہ میں اِس کا پڑھانا
بالکلیہ میرے سپرد کیا گیا تو وقت کم تھا اور چیزیں بہت، میں نے طلبار کے
سامنے جو زبانی لکچر دئے یا جو ابھی دینے باقی ہیں، ان کو سردیوں کی تعطیلوں
سے فائدہ اٹھا کر قلمبند کرتا ہوں۔ یہ چھوٹا سا رسالہ طلباء کی امتحانی ضرورتوں
کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اگر ضرورت سمجھی گئی تو آئندہ زیادہ ٹھوس اور
زیادہ پھیلا ہوا مواد پیش کیا جائے گا۔ اور علوم و فنون کے برخلاف قانون
بین الممالک کا تعلق زیادہ تر مملکتوں کے باہمی برتاؤ سے ہے اور اسی لئے
روز ہی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نصاب میں جس انگریزی کتاب کے
دیکھنے کی سفارش کی گئی ہے وہ گیارہ سال کی پرانی ہے۔ اس کے مواد کو

عصری بنانا پہلا مقصد ہے۔

درسی کتابوں میں صرف یوروپ یا امریکا کی نظریں دی گئی ہیں ہماری اپنی تاریخ کی مثالیں بھی جابجا دینا سامعین اور ناظرین کی دلچسپی بڑھانے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے مواد کو "اپنانا" یہ دوسرا مقصد ہے۔

ہر خود دار اور روشن خیال قوم کے لئے بین الممالک سماج میں اپنی حیثیت کو جاننے اور اپنے حقوق اور واجبات کو پہچاننے نیز بین الممالک سرکاری تعلقات کی آئے دن چھپنے والی خبروں کو سمجھنے کے لئے قانون بین الممالک سے واقفیت ناگزیر ہے۔ اِس موضوع پر پہلی کتاب پیش کرنے کی عزت حاصل کرنا آخری مقصد ہے ــــ اور یہ حقیر سعی علمی شایع کی جاتی ہے۔ فقط

۱۲۴

خانۂ خلیل
حیدرآباد دکن

۲۶ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ جمعۃ الوداع

حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ

دین الٰہی کی حکومت قائم کرنے کے قواعد کا مقصد و مطمح نظر یہ ہے کہ فتنہ و فساد دور ہو اور رام راج قائم ہو۔

مبادیات

ف ۱ ٹولیوں اور ریوڑوں میں مل جل کر رہنے والے جانوروں میں انسان سب سے زیادہ علاحدگی پسند ہے مگر اس کی بے قرار طبیعت جدائی میں بھی ملاپ کو ڈھونڈھتی ہے۔ آدم و حوا کا کنبہ ابھی گنتی کے افراد پر مشتمل تھا کہ اُن کا بیٹا قابیل (یا قابن) اپنی بیوی کے ساتھ الگ ہو گیا۔ عبرانیوں کے مطابق جب نسل پھیلنے سے کنبوں کی شاخیں بھی کنبے ہو گئیں تو آپس کی رقابتوں کے باعث اپنی ذات اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے چند چند رشتہ دار کنبے مل کر رہنے لگے اور اس طرح گھرانے بنے۔ لیکن جب گھرانوں سے بھی بچت نہ ہو سکتے اور سلامت رہنے کے سامان نہ ہوئے تو متعدد رشتہ دار گھرانے قریب رہتے اور امداد باہمی کر کے دوسرے گھرانوں کی دراز دستیوں سے اپنی مدافعت کرنے لگے۔ یہ قبیلے تھے۔ لیکن زن، زمین، زر اور زور کی چاہت چونکہ ناحق کام کرنے پر برابر آمادہ کرتی رہتی اس لئے ردعمل سے بچنے کے لئے قبیلوں کو

بھی حلیفی وغیرہ کے ذریعے اپنی قوت بڑھانے کی ضرورت پیدا ہوتی گئی۔
اب زمانہ آگیا کہ لوگ خانہ بدوشی اور بدویت کے تلخ تجربوں کے باعث جہاں جغرافی سہولتیں ملیں بستیوں کی مستقل زندگی بسر کرنے لگیں چنانچہ کئی کئی رشتہ دار یا حلیف قبیلے مل کر شہری مملکتوں کی بنیاد ڈالنے لگے۔
۲۵۔ کنبوں گھرانوں، قبیلوں اور شہروں کے باہمی تعلقات ہمیشہ صرف مخاصمانہ اور جھگڑالو ہی نہیں رہے: باہمی ضرورتوں سے لے اور دے پر عمل کرنے اور مسالمانہ اور ملاپ کی زندگی بسر کرنے کے بھی۔ جس کا بڑا ذریعہ بیوپار تھا۔ مواقع مہیا ہوتے گئے۔ مگر ان کے اختلاف کا تسویہ تلوار سے نہیں بلکہ آشتی اور انصاف کے ساتھ کرنے کے لئے قواعد اور قوانین کی ضرورت تھی چنانچہ انفرادی فیصلوں کی صوابدید رفتہ رفتہ رواج بن کر قاعدے اور قانون کی اہمیت اختیار کر گئی۔ غرض جنگ اور امن ہر دو حالتوں میں ان خود مختار وحدتوں کا برتاؤ جن قواعد اور اصول کے مطابق رہا اسی سے ہمیں بحث ہے۔ کسی وحدت کے افراد میں اختلاف پیدا ہوتا تو اُس وحدت کا صدر حکم دے کر یکسوئی کر دیتا۔ لیکن اختلاف اگر ایسے افراد میں ہوتا جن کا تعلق مختلف وحدتوں سے ہوتا تو مسالمانہ یکسوئی یعنی عدل گستری کے لئے جو کھم (آرڈیل)، قربانی، دیوبانی (اوراکل)، کہانت اور تحکیم وغیرہ سے مدد لی جاتی اور اس سے اطمینان نہ ہوتا تو آخر العلاج السیف بہرحال موجود تھا۔ اور تمدن و تہذیب میں جوں جوں ترقی ہوتی گئی خود جبر و زور کے طریقۂ تسویہ یعنی جنگ میں بھی انسانیت برتنے اور بے رحمی کو

گھٹانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ بین العائلات اور بین القبائل تعلقات
اگرچہ اب بھی ہیں لیکن ہم لوگ اب خود مختار شہروں کے دور سے بھی گزر کر خود مختار
ملکوں میں رہنے کے عادی ہو گئے ہیں اور خود بین المدن دور کے تعلقات کا
ذکر بھی صرف ایک سرسری ذکر سے زیادہ کا محتاج نہیں معلوم ہوتا۔

ف۳ ۔ ہر متمدن قوم کو شہری مملکتوں کے دور سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔
"مدینہ" (یعنی شہر) ہی سے لفظ "تمدن" بنا ہے۔ فینیقیا اور یونان مصر اور
ایران یا چین اور ہندوستان کے زرخیز علاقے ہی نہیں عرب کے ریگستانوں
نے بھی یہی نظارے دیکھے ہیں اور مکہ[عہ]، سبا، طائف، یثرب اور دومۃ الجندل
کی شہری مملکتوں کے دستور بھی ہمیں حیرت زدہ کرتے ہیں اتنا کہ اگر نام
حذف کر دیں تو ایتھنس اور اسپارٹا کا دھوکہ ہو۔

ف۴ ۔ ایک طرف یہ ظاہر ہے کہ وہ جذبہ جو انسانوں میں انفرادیت
کہلاتا ہے کنبوں اور گھرانوں میں یگانوں اور بیگانوں کے درمیان امتیاز
کے وقت اپنوں کی پچ کہلاتا ہے وہی جذبہ قبیلہ واری عصبیت کہلاتا ہے
اور اسی کو ہم اس سے بھی بڑی انسانی ٹولی میں "قومیت" کا امتیازی نام
عطا کر کے فخر کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ سماجی
اور سیاسی وحدتیں جن کا ہم ذکر کرتے رہے ہیں وہ عموماً باہم قریبی رشتہ دار
اور ایک ہی جد کی اولاد ہوتی ہیں۔ رشتہ جتنا قریب کا ہوتا ہے سلوک بھی

عہ دیکھئے میرا زیر طبع مضمون "شہری مملکت مکہ عہد آغاز اسلام پر اور اس کے اور دوسری
یونانی شہری مملکتوں کے ساتھ مقابلہ"۔

اتنا ہی زیادہ نرم اور مشفقانہ ہوتا ہے چونکہ ہم جد اور ہم نسل ہونے کے باعث کسی علاقے کی شہری مملکتوں کا تمدن بھی ایک ہی سا ہوگا اسی لئے خاص کر حالت جنگ میں "ہم تمدن" حریف کے ساتھ جو رعایت کی جاتی اور کی جا سکتی ہے وہ غیر تمدن کے حریف کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

۵۔ مصر کے فرعون رامسیس دوم (حکومت ۱۲۹۲ تا ۱۲۲۵ ق م) نے شمالی شام کے ایک حطی بادشاہ سے ایک جنگ کے بعد جو صلح کی (اور جس کی چاندی کی تختی پر کندہ اصل دستاویز دستیاب ہو گئی ہے) اس میں صراحت سے اس کا اقرار ہے کہ دونوں بادشاہ نہ صرف ہمیشہ دوست رہیں گے — (یعنی ایک دوسرے کی خود مختاری کو تسلیم کریں گے) بلکہ اجنبی حملہ آوروں کے خلاف حلیف رہیں گے۔ تاجر اور کاریگر ایک کے ملک سے دوسرے میں امن سے جا آ سکیں گے۔ ایک کے ملک سے جو ملزم فرار ہو کر دوسرے کے ملک میں پناہ گزیں ہو اس کی تحویل عمل میں آیا کرے گی۔[1]

فلسطین کے یہودی بادشاہ حضرت داؤدؑ (حکومت ۹۹۹ تا ۹۵۹ ق م) اور حضرت سلیمانؑ (حکومت ۹۵۹ تا ۹۲۹ ق م) نے بھی ہمسایہ بادشاہوں مثلاً فینیقیا کے شہر ٹائر کے (جسے آج کل غالباً صور کہتے ہیں اور جو دمشق کے مغرب میں ایک بندرگاہ ہے) بادشاہ حیرام (حکومت ۹۸۰ تا ۹۴۶ ق م) سے دوستی کے معاہدے کئے۔[2]

---

[1] ہولٹن سن ڈورف۔ ج ۱ ص ۱۶۸ نیز فیلیپ جلد ۳ ص ۱۶۳ الخ۔
[2] ہ اکر ج ۱ ص ۳۱ الخ۔

اس زمانے میں صرف یہودی ہی موحد تھے اس لئے دوسری قوموں کو وہ
اپنے مساوی سمجھنے سے انکار کرتے رہے۔ عمالقہ کی سات قوموں سے
وہ کبھی صلح کرنی نہیں چاہتے تھے اور ان کو نیست و نابود کرنے پر تلے
ہوئے تھے۔ دوسری قوموں سے وہ صرف اسی وقت صلح کرنی چاہتے
تھے جب وہ ماتحت اور باج گزار بن کر رہنے پر آمادہ ہوں۔ اگرچہ یہودی
مذہب یا یہودی نسل کی بادشاہتیں حضرت سلیمانؑ کے بعد ایک سے زائد
ہوگئیں لیکن ان کو زیادہ دن رہنے کا موقع نہیں ملا ورنہ شاید ان میں ایک
"بین ممالک یہودیہ" قانون ترقی کر جاتا۔

ہم نسل اور ہم تمدن قوم کا یہ کثرت خود مختار سیاسی وحدتوں میں بٹنا
اگرچہ ہندوستان، وسط ایشیا، چین، یونان اور متعدد ممالک میں نظر آتا
ہے لیکن قدیم ترین تاریخی داخلے یا رکارڈ جتنے زیادہ اور واضح یونان
کے ہیں اب تک ہمارے پاس کسی اور کے نہیں۔ یوں بھی یوروپی قانون
بین الممالک کی تاریخ میں اس کی اہمیت اور اثرات سب سے زیادہ ہیں
وائے۔ اگرچہ ہندوستان کے حالات سے ہمیں زیادہ دلچسپی ہو سکتی ہے
لیکن ہندوستان کی تاریخ زیادہ تر ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتی
ہے جب کہ آریاؤں کی آمد ہوئی۔ اس سے پہلے کی دراوڑی اور دیگر
ہندی نسلوں کی سیاسی تاریخ ابھی تک ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ اسی لئے
ان کے بین الممالک قانون کا پتہ چل نہ سکا ہے۔ مسکی ضلع رائچور وغیرہ کی
اثریاتی کھدائی کے نتائج کے طور پر ممکن ہے آئندہ کم از کم دکن کے

متعلق کچھ حالات معلوم ہو سکیں۔ آریائی ہندوستان میں رگ وید، منوسمرتی (سنہ ۵۰۰ ق م) مہابھارت (ارسطو اور سکندر اعظم کے ہمعصر راجا چندر گپتا کے وزیر کاوٹلیا کی طرف منسوب ہے) ارتھ شاستر (سنہ ۳۰۰ ق م) دیگر پرانوں، اسمرتیوں، اپنشدوں، ویدوں وغیرہ سے ہمیں جو حالات معلوم ہوتے ہیں ان سے بین الممالک برتاؤ کے بہت سے قواعد مستنبط ہو سکتے ہیں لیکن جاتیوں کی چہار گانہ تقسیم (علماء، سپاہی، پیشہ ور اور غلام میں) گائے کی عزت اور آلیر (حیدر آباد) وغیرہ میں کھدائی ہوئی قدیم قبروں (کیرن) میں ملی ہوئی چیزوں اور دریافت شدہ باتوں سے مصر[1] کے قدیم تمدن سے جو حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے اس کا اشارہ یہاں بے جا نہ ہوگا۔ قانون بین الممالک کی تفصیلی تاریخ لکھنے والا ان چیزوں کا زیادہ ذکر کرے گا۔ یہاں صرف اتنا بیان شاید کافی ہوگا کہ ہندوستان میں بھی آریائی نسل کی مملکتوں میں جو[2] خاص اصول برتاؤ کے تھے ان کے ملیچھ اور غیر ملکی مستحق نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ان کے متعلق سپہ سالار کی صوابدید ہی سب کچھ تھی۔ مزید تفصیلیں وسوا ناتھ کی کتاب میں ملیں گی۔

۶۔ بہرحال جیسا کہ بیان ہوا یونان کے حالات ہمیں نسبتاً زیادہ معلوم ہیں۔ خود سنہ ۱۲۰۰ ق م میں جب کہ الیون (ٹروے) پر سارا یونان چڑھ دوڑا تھا (اور جس کا تذکرہ ہومر نے اپنی رزمیہ نظم الیاڈ میں کیا ہے) یونان میں بہ کثرت ہم نسل، ہم رواج، ہم زبان، ہم مذہب خود مختار سلطنتیں

---

[1] میمان تھلاڑوس حصہ تاریخ قدیم باب اول۔ [2] پاسکال ص ۵۔

نظر آتی ہیں[1]۔ ڈیلفی میں جو مندر تھا اور اولمپیا میں جو میلہ لگتا اور کھیل کے مقابلے ہوتے تھے اس میں یونان کی ہر مملکت سے لوگ آتے تھے۔ اگرچہ ارسطو انہیں کے الفاظ میں "فطرت نے غیر یونانیوں کو غلام ہونے کے لئے ہی پیدا کیا ہے"[1] لیکن اندرون یونان جو بیسیوں خود مختار شہری مملکتیں تھیں، (جن میں سے بعض جمہوری تھیں تو بعض شاہی یا اعیانی، نیز بعض بڑی اور بعض چھوٹی) ان کے باہمی تعلقات میں برتنے کے لئے نوامیس یونان (لاز آف دی ہیلینیس)[2] پیدا ہو گئے۔ ان مملکتوں میں محالفے بھی قائم ہوتے تھے چنانچہ جو مملکتیں ڈیلفی کی امفکٹیونک لیگ ("یونانی مجلس اقوام") میں شریک ہوتی تھیں، وہ حلف لے کر اقرار کرتی تھیں کہ :۔

"ہم کسی امفکٹیونی شہر کو نہ تو تباہ کریں گے اور نہ اسے بہتے پانی سے"
"کاٹ دیں گے حالت امن ہو کہ جنگ۔ اگر کوئی اس کے خلاف"
"کرے تو ہم خلاف ورزی کرنے والے پر حملہ کر کے اس کے شہر کو"
"تباہ کر دیں گے۔ اگر کوئی خدا کی جائداد کو لوٹے یا لٹنا دیکھ کر چپ"
"رہے، یا ڈیلفی کے مندر کی خدائی جائداد کے خلاف غدارانہ"
"مشورے سنے تو ہم اس کو سزا دینے میں ہاتھ، پاؤں اور زبان"
"اور ہر اس چیز کے ذریعے حصہ لیں گے جو ہماری مقدرت میں ہو"[5]

---

[1] کتاب سیاسیات حصہ اول باب دوم و ششم ارسطو کی۔ [2] فنک، ص۸، فلپسن ج۱ ص۵۲ تا ۵۴۔ [3] فلپسن ج۱ ص۶۲ بحوالہ ہیرو ڈوٹس۔ [4] ہسٹری آف دی ورلڈ ص۱۱۰۷۔ [5] فلپسن ج۲ ص۱ بحوالہ ہاربپرک دستاویزات[1]م۔ نیز ولسن ص۱۶۔

وقت بوقت اِن امفکیتونیوں کے جلسے ہوتے اور مفادِ باہمی اور آپس کے جھگڑوں کے متعلق قرار دادیں اور فیصلے ہوتے[۱]۔ بعض وقت اعلانِ جنگ کا فیصلہ بھی وہیں ہوتا تھا[۲]۔

تفصیلات کا یہاں موقع نہیں (جس کے لئے دیکھو فلپسن) لیکن یہ بیان کرنا ہے کہ یونانیوں نے بڑے قدیم زمانے میں اس بات کی نظیر چھوڑی ہے کہ بہت سی خود مختار سلطنتیں ایک دوسرے کی خود مختاری کو مانتی ہوئی پُرامن طور سے ہمسایہ رہ سکتی ہیں اور ان کے باہمی تعلقات، برتاؤ کے چند ایسے مقررہ قاعدوں کے مطابق ہو سکتے ہیں جن کو سب مانتے ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ ان قواعد کا اطلاق صرف ہم نسلوں (یونانیوں) کے مابین ہوتا تھا، بربری (غیر یونانی) قومیں کسی بات پر حق نہیں خیال کی جاتی تھیں۔ ان سے یونانی قانون نہیں بلکہ نوامیس انسان یعنی عالمگیر (یا معقول و متناسب) قانون، متعلق ہوتا تھا مگر اس کی سختی اور نامعقولیت بڑی تھی۔

۵۔ اگرچہ سکندر اعظم نے ایک عالمگیر حکومت قائم کی مگر وہ زیادہ دن باقی نہیں رہی۔ روما جب تک شہری مملکت رہا رومیوں نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی وہ یونان سے متاثر رہے۔ البتہ تیسری صدی قبل مسیح کی ابتدا میں رومیوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی اور دنیا کے مالک ہونے کا دعویٰ شروع کیا۔ اس کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بہت سی قومیں رہتی تھیں۔

[۱] بیتھنی لارنس (لفظ امفکیتونیہ) ص ۱۵۶ آماری ص ۱۵۶۔ [۲] فلپسن حصہ ۱ ص ۱۰۴ تا ۱۰۶۔

سلطنت روما کا اصول یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کو بڑی حد تک اندرونی خود مختاری عطا کرے۔ ان ماتحت حکمرانوں میں اگر کوئی جھگڑے پیدا ہوتے تو "قیصر روم" کے پاس مرافعہ ہوتا اور اس کا حکم فیصلہ کن ہوتا[1]۔ اس طرح ایک "عام برتر حاکم" کا تصور پیدا ہو گیا جو بعد میں بہت سی قوموں میں موروث ہو کر بہت دن تک باقی رہا۔ لیکن سلطنت روما کے اندر بسنے والوں کے قانون بین الاقوام کو قانون بین الممالک کہنا سخت غلطی ہے:

اس دور کا اصلی قانون بین الممالک وہی ہے جو سلطنت روما کے ساتھ اُن ممالک کے تعلقات میں برتا جاتا تھا جو سلطنت روما کے باہر اور اس کی سرحد پر تھے مثلاً ایران وغیرہ اور جس کو "قانون جنگ" اور "قانون مجلس خارجہ" (یُس فیتیالی) کہتے تھے۔

رومیوں نے دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا[2]، رومی سلطنت، معاہد ممالک اور حربی ممالک۔ معاہد ممالک کی رعایا سلطنت روما میں آتی تو محفوظ رہتی اور اُن کے لئے کوئی شکایت یا مخاصمت پیدا ہوتی تو پریٹر پیریگرینس (مفتی عدالت خارجہ) کے مشوروں سے یُس گینتیم (قانون اقوام) کے مطابق انصاف رسانی بھی ہوتی (جو موجودہ "تصادم قوانین" سے مشابہ اور جس کو رفتہ رفتہ قانون فطرت کے مطابق سمجھا جانے لگا تھا)۔ جن ممالک سے دوستی، مہمان نوازی یا حلیفی کا کوئی معاہدہ نہ ہوتا وہ حربی سمجھے جاتے۔ بجز سفیروں کے، حربی باشندے سلطنت روما میں اور رومی باشندے حربی ممالک میں

---

[1] ناش جنگ صفحہ ۱۱ — [2] اوپن ہائم جلد نمبر ۱، صفحہ ۵۹

جان و مال کی حفاظت پانے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ اور جب کبھی جنگ چھڑتی یا صلح یا دوستی ہوتی یا کسی اجنبی مملکت سے کوئی مطالبہ ہوتا تو قبیلائی مجلس (جس میں سب سپاہی ہوتے تھے) کام انجام دیتی لیکن جنگ کی صورت میں بجز اس کے کہ اعذار و انذار اور اعلان جنگ ہو، حربی کے کوئی قانونی حق نہیں مانے جاتے تھے اور صرف صوابدید پر عمل ہوتا۔[۱]

۹۔ اس اثنا میں مسیحیت جو فلسطین میں پیدا ہوئی تھی، سینٹ پیٹر وغیرہ کے ذریعے اٹلی پہنچ گئی اور کئی صدیوں کی کشمکش کے بعد وہ سرکاری مذہب بن گئی لیکن یہ یاد رہے کہ مسیحیت کے ساتھ بین الممالک قانون ایک ناممکن سی چیز ہے کیونکہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم یہ رہی ہے کہ کسی عیسائی کے لئے نہ صرف اپنی مدافعت قوت کے ذریعے کرنی ناجائز ہے بلکہ خود حکومت کے قانون کی امداد بھی چاہی نہیں جاسکتی۔[۲] روما کے مسیحی شہنشاہ قسطنطین اعظم (۲۷۴ء تا ۳۳۷ء) کی ہلاکت گیرانہ سرگرمیوں نے اور پھر سینٹ آگسٹائن (۳۵۴ء تا ۴۳۰ء) کے خیالات نے عیسائیوں کے ہاں جنگ کو جائز بنانے میں کامیابی حاصل کی۔[۳] دوسرے الفاظ میں جب انھوں نے اپنے مذہب کے بانی کی اصولی تعلیم ترک کر کے دنیاپرستی شروع کی تو پھر ان کے ہاں بھی رزم کی بزم آرائیاں شروع ہوئیں۔ اگرچہ جنگ کے جواز کے بعض مولف اب بھی مخالف رہے لیکن نقار خانے میں ان طوطیوں کی آواز کون سنتا۔ آخر چودھویں صدی کے اواخر اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں نوہو نورے لیٹے اور کرسٹین

---

[۱] فنیاک ص۱۱ الخ۔ [۲] اوپن ہائم ج۱ ص۵۹ الخ۔ [۳] نیس ص۳۲۔ [۴] نیس ص۴۵۔

ڈریپیزان نے خون آشام جنگوں کے متعلق[1] یہ نظریئے پھیلائے کہ وہ انسان کی شامت اعمال کے باعث خود خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ اور سپاہی ایک اچھے اور نیک کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں[1]۔ قرون متوسطہ میں اگر کہیں کہیں سے مذہبی علماء امن و سلامتی کی آوازیں بلند بھی کرتے تو وہ پیروان مسیحیت کی حد تک تھا ورنہ غیر مذہب والوں کے حق میں وہ بھی کھلم کھلا مخاصمت کا اظہار کرتے تھے۔ "خدا کشی" کے الزام میں یہودیوں سے اس بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا کہ بابد و شاید۔ عیسائیت کے گہوارے اور ارض مقدس یروشلم پر مسلمانوں کے قبضے اور اُن کی ناقابل شکست قوت نے ان کو بھی عیسائیت کے نزدیک مطعون[2] کر کے کچھ ایسا قابل گردن زدنی قرار دیا کہ آج ڈیڑھ ہزار سال ہونے کو آئے مگر یہ مخالفت پھر بھی کم ہوتی نہیں معلوم ہوتی خلفائے راشدہ نے عیسائیت کے مرکزوں بیت المقدس اور اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ اُمویوں، عباسیوں، اندلسیوں اور پھر عثمانی ترکوں نے عیسائیت کو جو نیچا دکھایا تو اس کا ناگزیر نتیجہ شاید یہی تھا کہ "جنگ کی شدت کو کلیسا نے شدید تر کر دیا"[3] اور ستم ظریفی دیکھئے کہ راہبوں نے جنگی نظام قائم کئے ٹمپلر، ہاسپٹیلر، آرڈر آف سینٹ جان، ٹیوٹانک آرڈر وغیرہ مذہبی راہبوں کے جنگی نظاموں[4] اور ان کی کارگزاریوں سے کون واقف نہیں۔ ان نظاموں اور صلیبی جنگوں کا ایک منشا کلیسا کے روبہ زوال اثر کا اعادہ بھی تھا۔ اور تعلیم[5] کا نامور پروفیسر اور ماہر تاریخ قانون بین الممالک نیس بیان کرتا ہے کہ جب امریکا دریافت ہوا تو شہزادۂ امن

---

[1] نیس ص ۴۷ ـ [2] ایضاً ص ۱۳۰ ـ [3] ایضاً ص ۱۳۱ الخ ـ [4] ایضاً ص ۱۴۲ الخ ـ [5] ایضاً ص ۱۵۳ ـ

کے نام لیواؤں نے اسپینی پادری لاس کازاس (سنہ ۱۴۷۴ء تا سنہ ۱۵۰۶ء) کے مطابق اڑتیس سال کے عرصے میں ایک کروڑ بیس لاکھ "کافر" امرنڈیوں (امریکی ہندیوں) سے دنیا کو پاک کیا۔[1] آکسفورڈ یونیورسٹی کے اطالوی پروفیسر آلبیریکس جینٹیلس (جس نے سنہ ۱۵۹۸ء میں قانون جنگ پر ایک بڑی مشہور کتاب شائع کی تھی اور جسے اپنے وطن سے پروٹسٹنٹ خیالات کی بنا پر مصیبتیں اٹھا کر نکلنا پڑا تھا)، یہ کہتا ہے کہ "مذہب کی بنا پر کوئی جنگ نہیں ہونی چاہیئے"۔[1] اور پھر یہی مولف یہ عجیب جملہ لکھتا ہے کہ "عیسائیوں اور ترکوں (مسلمانوں) میں ایک ناقابل مصالحت جنگ ہے"۔[2] یہی نہیں بلکہ غیر عیسائی ممالک سے تجارت تو جائز تھی لیکن حلیفی کی مذہب ممانعت کرتا تھا۔[3] عیسائی بادشاہوں کی باہمی جنگوں نے بالآخر اس کو بھی جائز کر دیا اور غیر عیسائیوں خاص کر مسلمانوں کی حلیفی سے بھی مدد لی جانی شروع ہو گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۵۳۵ء میں فرانس اور ترکی میں دوستی کا معاہدہ ہوا اور سنہ ۱۵۴۳ء میں شہر نیس کے محاصرے میں ترکی امیر البحر باربروس بھی فرانسوا اوّل کے ساتھ شریک تھا۔[4] مگر یہ سنہ ۱۸۵۶ء تک ممکن نہ ہوا کہ کسی غیر عیسائی مملکت کو "یوروپی قانون بین الممالک" کے حقوق و مراعات سے متمتع ہونے کی اجازت دی جاتی۔ اُس سال ایک صلح نامے کی شرطوں کو طے کرنے کے لیئے مجبوراً ترکی کو یوروپی سلطنتوں کے سماج میں صراحت کے ساتھ شریک کیا گیا۔[5] سنہ ۱۸۹۵ء میں جاپان نے چین کو شکست دے کر اپنی قوت قائم کی

---

[1] جینٹیلیس، حصۂ اول باب نہم۔ [2] ایضاً حصۂ اوّل بابِ دوازدہم، (بحوالۂ نیس صفحہ ۱۵۷)۔
[3] نیس صفحہ ۱۵۸، [4] ایضاً صفحہ ۱۶۲۔ [5] فنک صفحہ ۱۰۴ اوپن ہائم حصہ ۱ صفحہ ۳۹۔

تو اس کو بھی مہذب تسلیم کیا گیا پھر رفتہ رفتہ چین، ایران اور سیام کو بھی مشروط طور سے تسلیم کیا گیا۔ پھر ابی سینیا، عراق، افغانستان وغیرہ کی بھی باری آئی۔

غرض جیسا کہ بیان ہوا کہ عیسائیوں کو حکمرانی کی ضرورتوں کے لیئے جب اپنے مذہب کی اصولی چیزیں چھوڑنی پڑیں تو پھر انھوں نے سیاست اور بین الممالک معاملت کے لیئے انجیل کی جگہ رومی قانون پر دوبارہ توجہ کی۔ اور شاید اسی کا اثر تھا کہ رومی شہنشاہت ختم ہونے کے بعد بھی اس کا نام باقی رکھنے کی کوشش صدیوں باقی رہی۔

ف ۱۔ رومی قانون کی خصوصیتیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ یوروپ میں اس کے احیا اور تجدید کے بعد خود بخود وہ صورت حال قائم نہیں ہو گئی جو ہم اب دیکھ رہے ہیں بلکہ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، ان کو اس دوران میں مسلمانوں سے بھی سابقہ پڑا۔ یہ کس طرح ہوا اور اس کے کیا اثرات ہوئے کسی قدر تفصیل کے محتاج ہیں خاص اس لیئے کہ اس سے ہماری انگریزی درسی کتابیں عمداً یا ناواقفیت کی بنا پر خاموش رہتی ہیں۔

سنہ ۵۷۰ء میں حضرت محمدؐ کی شہر مکہ میں ولادت ہوئی۔ چالیس سال کی عمر میں انھوں نے خدا کے نبی اور رسول ہونے کا دعوا کر کے اپنے ہم وطنوں اور ہم عصروں کی ہر جہتی اصلاح شروع کی۔ سنہ ۶۲۲ء میں ہم وطنوں کی مخالفت سے مجبور ہو کر آپ مدینہ ہجرت کر گئے اور اس شہری مملکت کے باشندوں کے بہ کثرت مسلمان ہونے کے باعث وہاں کے مختار کل ہو گئے۔ ہجرت کے بعد آپ صرف دس سال زندہ رہے لیکن اس عرصے میں ایک سیاسی امّت (پارٹی) کی بنا ڈالی

جس کا دستور العمل کلام اللہ یعنی قرآن مجید مقرر کیا گیا جو آپ پر وحی کے ذریعے وقتاً فوقتاً
الہام ہوا تھا۔ اور تمام مذہبی پیشواؤں کے برخلاف آپ نے ایک مملکت قائم کی اور خود
چلا کر نمونہ عمل بھی چھوڑا۔ دس سالہ مدنی زندگی میں آپ کا اقتدار شہر مدینہ سے
پھیل کر جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین کے دس لاکھ مربع میل رقبے پر محیط ہو گیا۔
اس عرصے میں آپ کو بہت سی لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں لیکن اس پوری فتح کے لئے
دشمن کے بمشکل ڈھائی سو آدمیوں کا خون بہایا گیا اور (اگر بیر معونہ میں دھوکے
سے اور اُحد میں فوجی نافرمانی کے نتیجے بھاگڑ کے وقت قتل شدہ (۱۳۰) آدمی مستثنا
کر دئے جائیں تو) مسلمانوں کے بمشکل ایک سو آدمی مارے گئے تھے۔ غرض عہد نبوی
میں دس سال تک اوسطاً روزانہ دو سو چوہتر مربع میل کا رقبہ فتح ہوا اور مسلمان فوج
سے دس سال تک اوسطاً ماہانہ صرف ایک آدمی مارا جاتا رہا۔ کوئی حیرت نہیں جو
انسانی خون کی اتنی عزت کرنے والے موسّسِ سلطنت ہی کی تعلیم سے جنگ کی
بے رحمی کم ہو گئی ہو۔ آنحضرت صلعم کے بعد دس ہی بارہ سال میں مسلمان شدہ
عرب مشرق سے مغرب تک پھیل گئے اور مصر و طرابلس، فلسطین و شام، عراق و
آرمینیا، ایران و ترکستان سب ان کے زیر نگیں ہو گئے اور قیصر و کسرا کی حکومتیں
انھوں نے زیر و زبر کر دیں۔ ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ اسپین و فرانس
اور اٹلی و ہندوستان تک ان کے قدم پہنچ گئے اور صدیوں وہاں داد حکومت
دیتے رہے اور اکثر مقاموں کا نہ صرف مذہب بلکہ زبان تک بدل دی۔ (اس
سلسلے میں میرے فرانسیسی مقالے "لا دپلوماسی مسلمان" میں کافی تفصیلیں ملیں گی)۔
آنحضرت صلعم نے جس امت (سیاسی و مذہبی وحدت) کی بنا رکھی اس میں

اخوت، مساوات اور یکجہتی کی تعلیم کار فرما تھی۔ اسی لیئے یہ ناممکن تھا کہ ایک قانون مابین ممالک اسلامیہ کی (یعنی ایسے قواعد کی جو صرف خود مختار اسلامی مملکتوں میں آپس میں برتے میں آئیں) نشو و نما ہو سکے۔ قرآن اور آنحضرت صلعم کی تعلیم یہ تھی کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں ان میں آپس میں جدال و قتال نہ ہو اور سب ایک ہی امیر کی اطاعت کریں۔ اسی لیئے قرآن و حدیث میں حقیقی معنوں میں "قانون مابین ممالک اسلامیہ" ہمیں نہیں ملتا سوائے اس ایک آیت کے کہ "اگر مومنوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ اگر ایک نے دوسرے سے بغاوت کی ہو تو باغی سے لڑو تا آنکہ وہ خدا کا حکم پھر مان لے" (قرآن سورہ ۴۹ آیت ۹-۱۰) سنہ ۳۵ھ کے لگ بھگ جب مسلمانوں میں پہلی بار خانہ جنگی ہوئی تو ایک فریق کے سرگروہ حضرت علی کے سے خدا ترس، رحمدل اور اصول پسند شخص تھے۔ حریف جماعت کے ساتھ جنگ میں برتاؤ کے انھوں نے جو احکام دیئے وہ اتنے مطحی تھے کہ شاید انھیں کی بنا پر وہ ناکام رہے اور جنگی فتح پر فتح کے باوجود بالآخر بعض اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

جیسا کہ عرض ہوا، قانون اسلامی کے اصل ماخذوں یعنی قرآن اور سنت میں اسلامی قانون مابین ممالک اسلامیہ بالکل نہیں ملتا لیکن مسلمانوں کا قانون بین الممالک بڑی تفصیل سے ملتا ہے کہ مسلمان حکمران غیر مسلم ممالک سے حالت امن و جنگ و غیر جانبداری میں کس طرح برتاؤ کرے۔ (اس پر جرمن زبان میں میں نے ایک مفصل مقالہ لکھا ہے جس کا ایک حصہ چھپ بھی گیا ہے)۔

ے پوری تفصیل مسعودی کی مروج الذہب میں حضرت علی کے حالات کے تحت ملے گی۔

اس طرح یہ ناگزیر بات تھی کہ حقیقی اور عالمگیر قانون بین الممالک سب سے پہلے
مسلمانوں میں پیدا ہوتا۔ چنانچہ عربوں نے احکام، نظائر اور رواج وغیرہ کو مدوّن
کر کے اس قانون کو نہ صرف بڑی ترقی دی بلکہ پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی
میں اسے ایک مستقل اور علاحدہ فن بنا دیا۔ عربوں نے اس قسم کے قانون کو (جس کی
پابندی ان پر ویسی ہی تعبدی تھی جیسی عام قانون ملک کی) سیر یعنی "برتاؤ"
کا نام دیا۔ ابن ہشام (ق ۲۱۸ھ) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ عہد نبوی
ہی سے کم از کم جنگ میں برتاؤ کے متعلق برتا جانے لگا تھا۔ اور ابن حبیب (ق ۲۴۵ھ)
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ نہ صرف جنگ بلکہ امن کے زمانے میں بھی غیر ممالک کے
ساتھ سرکاری برتاؤ کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اور سرخسی (ق ۴۸۳ھ) نے
قانون بین الممالک کی تعریف اور لفظ "سیر" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے جو
الفاظ لکھے ہیں[۱] ان سے زیادہ جامع ومانع الفاظ ممکن نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ لفظ
سیر "سیرت" کی جمع ہے۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مشرک حربیوں،
معاہدوں، مستامنوں، مرتدوں اور باغیوں سے مسلمانوں کے برتاؤ کا ذکر ہوتا ہے۔[۱]

آنحضرت اور آپ کے بعد خلفاء نے سپہ سالاروں کو روانگی کے وقت جو
ہدایتیں دیں وہ تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں[۲]۔ اور ہالینڈ کے ترقیاتی دخوبے
(آسچھانی) کو اعتراف ہے[۳] کہ فاتح عربوں کے برتاؤ کو دیکھ کر مفتوح ممالک کے
باشندے بے اختیار ان کی طرف مائل ہو گئے اور ان کی ہر طرح مدد کرنے لگے تھے۔

---

[۱] اس فقرے کے حیلہ معلومات کے حوالے میرے جرمن مقالے میں مل سکیں گے۔ [۲] عہد نبوی کیلئے صحیح مسلم ج ۵
ص ۱۳۹ الخ میں، عہد ابو بکرؓ کیلئے تاریخ طبری ص ۱۸۴۹ الخ میں اور عہد عمرؓ کیلئے ابن قتیبہ کی عیون الاخبار ج ۱ ص ۱۰۷ الخ
میں بھی دستاویزیں ملیں گی۔ [۳] کتاب المبسوط ج ۱۰ ص ۲۔ [۴] دخویے ص ۱۰۴۔

ف ۱۱ جب ایسی قوم سے عیسائیوں اور یوروپیوں کو سابقہ پڑا تو ان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تصورات قانون بین الممالک، یوروپ کے رومی دور اور جدید دور کے مابین ایک مستقل وحدت اور ایک حلقۂ اتصال کا کام دیتے ہیں۔ اس کی تائید میں اور بھی کئی باتیں عرض کرنی ہیں۔

ف ۱۲ رومی سلطنت جب عمر طبعی کو پہنچ کر خانہ جنگیوں اور اجنبی حملوں کا شکار ہو گئی تو قدر نعمت بعد زوال، اس کے امن و امان اور عظمت کا یوروپ میں ہر طرف حسرت کے ساتھ ذکر ہوتا تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں رومی غرور کا یہ حال تھا کہ روما کو "سدا آباد شہر" سمجھا جاتا تھا اور خود "سلطنت روما" کی بطور دیوتا پرستش ہوتی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روما کے خاتمے کے بعد یوروپ میں خانہ جنگیوں اور تاراج کی سی کیفیت تھی جو صدیوں تک جاری رہی اور ساتویں صدی عیسوی کے ثلث دوم کے آغاز پر متحد عربوں میں خلافت کا آغاز اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پر ابھی چودہ برس بھی نہیں گزرے تھے کہ سنہ ۲۷ھ/۶۴۷ء میں خلیفہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے اسپین پر حملہ کرکے اس کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا[1] اور سنہ ۳۲ھ/۶۵۲ء میں بیزنطینی سلطنت سے فلسطین، شام، مصر اور آرمینیا چھین لینے کے بعد خود اس کے پائے تخت قسطنطنیہ پر دھاوا بول دیا حالانکہ اس سے کچھ پہلے تک قیصر روم خود مکے کے دستوری معاملات میں مداخلت کیا کرتا تھا[2]۔ یوروپ پر مشرق اور مغرب سے ان

[1] تاریخ طبری ص ۲۸۱۷ نیز گبن جلد ۵ ص ۵۵۵ [2] ایک واقعہ معارف ابن قتیبہ طبع یوروپ ص ۱۴۳ اور دوسرا سہیلی کی الروض الانف جلد ۱ ص ۱۴۶ میں ہے۔

حملوں کا لگاتار سلسلہ جاری رہا اور ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ موسیو پشیر[1] کے
الفاظ میں مسلمانوں کی حکومت ایک ہلال کی شکل میں دنیا میں پھیل گئی جس کا ایک
سرا پیرینیز کی چوٹیوں پر تھا تو دوسرا سرا چین کے پہاڑوں پر۔ اور اس سب
علاقے پر صرف ایک خلیفۃ المسلمین حکمرانی کرتا تھا جو مذہبی امام بھی تھا اور سیاسی
امیر بھی تھا۔ اہل یورپ اس کو دیکھتے تھے اور کچھ کر نہ سکتے تھے۔ یورپ میں
عیسائیت پھیل چلی تھی اور پوپ کا روحانی اقتدار جو بے حد منظم تھا، ہر کوئی مانتا تھا۔
اس کا شہر روما میں رہنا بھی ایک عجیب اتفاق تھا جہاں کی عظمت ماضی اب بھی
ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اختتام پر یورپ کی صورت
حال نے پلٹا کھایا۔ فرنگی بادشاہ شارلمان (۷۴۲ء تا ۸۱۴ء) نے
یورپ میں ایک بڑی سلطنت قائم کرلی۔ ادھر اسی زمانے میں لیو سوم (پاپائی ۷۹۵ء
تا ۸۱۶ء) سا بیدار مغز اور زمانہ شناس شخص پوپ منتخب ہوا تھا۔ شارلمان کی
مذہبیت نے انجیل اور تلوار کے آب و آتش کا اتحاد ممکن کردیا۔ چنانچہ ۸۰۰ء
کی کرسمس کے دن پوپ لیو نے شارلمان کو رومی سلطنت کا تاج شہنشاہی پہنایا۔[2]
اس "مقدس رومی سلطنت" کے مذہبی فرائض پوپ کے قبضے میں رہے اور سیاسی فرائض
شہنشاہ کے اور جملہ عیسائی یورپ کے گویا یہ مشترکہ سردار ہوگئے۔ اور پوپ اور شہنشاہ
ایک دوسرے کی تائید سے اپنی اس برتری اور اقتدار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے
رہے۔ آدمیوں کی طرح سلطنتوں کے طرز عمل کی نگرانی اور جھگڑوں کی تحکیم پوپ کے
ہاتھ میں رہی۔ اور شہنشاہی کا عہدہ مختلف خاندانوں اور مختلف ممالک کے بادشاہوں

---

[1] سوانح حجاج بن یوسف (فرانسیسی) کا مقدمہ ص ۱۲۔ [2] ادیان عالم حصہ ۱ ص ۶۲ الخ۔ فنک ص ۱۴۔

کے ہاتھ میں گھومتا رہا اور جرمن شہنشاہ سنہ ۹۶۲ تا ۱۸۰۶ء تک "دنیا کے بادشاہ" رہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اسی تنازع کے کچھ ہی بعد سے بغداد میں بھی مسلمان خلفا اپنے دنیاوی اقتدار سے محروم ہو کر امیر الامرا اور پھر بعد میں سلطانوں کو اپنا اقتدار عملاً سپرد کر دینے پر مجبور ہو گئے۔

۱۳۵ ظاہر ہے کہ تقسیم فرائض شہنشاہ اور پوپ میں ایسی نہ تھی کہ ان میں تصادم نہ ہوتا۔ چنانچہ جلدی ہی یہ دونوں اقتدار حلیف کی جگہ رقیب بن گئے اور ابتدا میں پوپ کو جو فوقیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۰۷۷ء میں شہنشاہ ہنری چہارم جیسے باجبروت حکمران کو پوپ سے ہار ماننی پڑی۔ اسی زمانے میں اسلامی ممالک خاص کر سسلی اور اسپین کے تہذیبی اثرات کے تحت یوروپ میں جو ذہنی آزاد خیالی پیدا ہوئی تھی اس کے باعث پوپ کے اقتدار سے ناراضی بڑھتی ہی گئی اس کے سنبھالنے کے لئے کی ہوئی صلیبی جنگوں (سنہ ۱۰۹۶ء تا سنہ ۱۲۹۱ء) کے سلسلے میں مغرب کی طرح مشرق کے اسلامی اثرات بھی یوروپ میں آنے لگے۔ اور اگرچہ خلافت عباسیہ کے آغاز کے ساتھ ہی سنہ ۷۵۶ء سے اسپین خود مختار ہو گیا تھا لیکن وہاں کے باجبروت سلاطین کو بھی دو سو سال تک ہمت نہ ہوئی کہ اپنے کو خلیفہ کہیں۔ جب بغداد میں خلافت ایک واقعی کی جگہ ایک نظری ادارہ ہو گئی تو پھر عبدالرحمان ثالث (حکومت سنہ ۹۱۲ء

۱؎ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یوروپ میں قانون بین الممالک کے ابتدائی مولف عموماً اسپینی اور اطالوی ہی ہیں جو اندلس اور سسلی کے اثرات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ عیسائی اسپین کے قانون جنگ پر اسلامی اثرات کی اہمیت کے اعتراف کیلئے دیکھئے نیس ص ۲۰۹ الخ۔

تا ۹۶۱ء) نے جمعہ ۱۶ جنوری ۹۲۹ء سے "امیر المومنین الناصر لدین اللہ" کا لقب اختیار کر لیا، اور اسلامی داخلی یکجہتی پر پہلا وار ہوا جب ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ کی ابتدا میں بغداد کی خلافت عباسیہ کا ہلاکو خاں کے ہاتھوں خاتمہ ہو گیا تو پھر یکے بعد دیگرے اسلامی خود مختار ملک وجود میں آتے گئے جن پر قاہرہ اور پھر استانبول کے خلفا کا برائے نام بھی اثر نہیں رہا۔ یہی حال یوروپ کی پاپائی کا بھی رہا۔ پندرھویں صدی سے اس کی جو مخالفت شروع ہوئی تھی اور گناہوں سے برات جب بکثرت "فروخت" ہو کر اباحیت عام ہونے لگی تو پھر لوتھر وغیرہ نے خلوص سے مذہبی اصلاح کی تحریک شروع کی اور جس کو انگلستان کے ہنری ہشتم وغیرہ کے بوالہوسانہ اغراض سے بھی بڑی مدد ملی اور بالآخر یوروپ کے بہت سے ممالک میں پراٹسٹانٹزم یا جدید "احتجاجی مذہب" پھیل کر سولھویں صدی کے اواخر سے ایسی یوروپی عیسائی سلطنتیں وجود میں آتی گئیں جو قومی خود مختاری کی اساس پر قائم تھیں اور برائے نام بھی کسی بیرونی اقتدار کی ماتحتی ناپسند کرتی تھیں اور یہ ایک عجیب انقلاب کا زمانہ تھا کہ فلارنس کے دانتے (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) نے جو نظریۂ اتحاد پیش کیا تھا اس کو اسی کے ایک ہم شہری ماکیاؤیلی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء) نے دو ہی سو سال بعد نیست و نابود کر کے بین الممالک تعلقات میں سیاسی اباحیت پھیلا دی مگر خوش قسمتی سے آیالا اور جنتی لیس نے قوانین فطرت کو حالت جنگ میں ملحوظ رکھنے پر زور دے کر یوروپ میں پیدا ہونے والے قانون بین الممالک کے خدوخال

عہ تلفظ کے لئے دیکھئے کتاب کی ابتدا میں "املا اور اعراب"۔

بدل دُے فریڈرک سوم (فوت سنہ ۱۴۹۳ء[1]) وہ آخری شہنشاہ تھا جس کی
پوپ کے ہاتھوں روما میں تاج پوشی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب قومیت کی تحریک
عام ہوگئی تو ضرورت پیدا ہوئی کہ ان خودمختار سلطنتوں کے باہمی برتاؤ کے لئے
قواعد بنیں چنانچہ مشہور جنگ سی سالہ ختم ہو کر جب سنہ ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فالیا میں
معاہدۂ صلح مرتب ہوا تو پہلی مرتبہ صراحت کے ساتھ سلطنتوں کی مکمل خودمختاری تسلیم
کی گئی اور بین الممالک کانفرنسوں کے ذریعے باہمی برتاؤ کے قاعدے بنانے کا
آغاز ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے تک غیروں سے برتاؤ کے لئے قانون فطرت سے
مدد لینے کی ترغیب دی جاتی اور کوشش کی جاتی رہی تھی۔ سنہ ۱۵۸۲ء میں آیالا
نے اور سنہ ۱۵۹۸ء میں جنٹلیس نے قوانین جنگ پر کتابیں لکھیں اور قانون
فطرت کی اتباع پر زور دے کر جنگ کی بیڑیوں کو گھٹانے کا مشورہ دیا اور
سنہ ۱۶۲۵ء میں گروتیوس نے یہ دیکھ کر کہ اس کے زمانے میں جنگ میں وہ وہ
باتیں روا تھیں کہ جن پر وحشی اقوام بھی شرما جائیں" بین الممالک تعلقات میں
اخلاقی برتاؤ پر زور دیا تھا جس کو تمام کمزوروں نے بدل و جان پسند بھی کیا۔
گروتیوس نے قانون فطرت کے ساتھ ساتھ رضامندیٔ ممالک متعلقہ کو بھی قانون
بین الممالک کا ایک ماخذ قرار دیا۔ اگرچہ زوش نے سنہ ۱۶۵۰ء میں دوبارہ
رسم و رواج ہی کو قانون بین الممالک کا ماخذ بنانے کی کوشش کی مگر پوفنڈروف
نے سنہ ۱۶۷۲ء میں قانون فطرت پر بے انتہا زور دے کر اس ردعمل کو روکا"
اور آخر سنہ ۱۷۴۹ء میں واتل[2] نے قانون فطرت کے نظریوں کی تشریح اور

۱؎ لارنس ص ۱۱۶ ۔ ۲؎ تلفظ کے لئے دیکھئے کتاب کے شروع میں "املا اور اعراب"۔

قانونِ رواجی و معاہداتی کی اصلاح و ترقی میں قانونِ فطرت سے رجوع کیا کرنے پر زور دیا تاکہ مطلوبہ صورتِ حال پیدا ہو سکے اور موجودہ قانون کی برائیاں دور ہو سکیں اور معاہدات میں قانونِ فطرت کا لحاظ رکھا جایا کرے۔ اس کے بعد سے معاہدات کی اہمیت روز افزوں ہے۔

۵۱۴۔ جیسا کہ اوپر ۵۹ میں بیان ہوا، سنہ ۱۸۵۶ء سے یورپ کے قانونِ بین الممالک کا حقیقی دور شروع ہوتا ہے۔ معاہدات کے ذریعے آئندہ جنگ کے لئے برتاؤ کا مقرر کر لینا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں خاصا قدیم رہا ہے۔ چنانچہ امام محمد الشیبانی (ف سنہ ۱۸۹ھ) نے اپنی کتاب السیر[۱] میں اس سے بحث کرتے ہوئے بہت سی مثالیں دی ہیں کہ اسیروں سے برتاؤ، مفتوحہ ملک کی تباہی وغیرہ بہت سے امور کے متعلق کس قسم کے پیشگی معاہدے مناسب اور کیسے نامناسب ہیں۔ یورپ میں عیسائی و غیر عیسائی، یورپی و غیر یورپی کا امتیاز اٹھا کر ہر قسم کی خود مختار مملکتوں کا مل کر باہم بین الممالک تعلقات کے برتاؤ کے قواعد بنانا بھی سنہ ۱۸۵۶ء ہی سے شروع ہوتا ہے چنانچہ دستخط کنندگان کے علاوہ اوروں کی آئندہ شرکت کی گنجائش رکھی جانی لگیں، اور سنہ ۱۶۲۳ء میں ایمرِک کروسے[۲] نے تمام دنیا کی مملکتوں کا ایک اتحاد یا عہدیہ قائم کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی وہ قسمت کی بہت سی گردشوں کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں مجلس اقوام کی صورت میں وجود میں آتی ہے۔

۱؎ شرح السیر الکبیر مطبوعہ دائرۃ المعارف حصہ ۱ صفحہ ۲۱۰۔

۲؎ اوپن ہائم حصہ ۱ ص ۶۶

اس دورِ تقویم[عہ] نے جو کچھ اب تک دیکھا ہے اس کا اپنے موقع پر ذکر آئے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرکز گریز انسانی کنبوں کی مرکز کشی کا جو مظاہرہ مختلف دوروں میں مختلف صورتوں سے ہوتا آرہا تھا، مجلس اقوام اس کا جدید ترین ارتقائی مظاہرہ ہے اور کسے معلوم کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

عہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا بانی امریکا اس میں شریک ہونے سے انکار کر گیا۔

تعریف اور نام

۱۵ لارنس کے الفاظ میں "انٹرنیشنل لا [قانون بین الممالک] سے مراد وہ قاعدے ہیں جو متمدن مملکتوں کی جماعت عامہ کے باہمی برتاؤ میں ان کے کردار کا تعین کرتے ہیں"۔

دوسرے الفاظ میں ان قاعدوں کا جاننا مطلوب ہے جن پر واقعی عمل کیا جاتا ہے کہیں کہیں اور کبھی کبھی خلاف ورزی ہو تو اس سے بحث نہیں۔ اسی طرح، مملکت سے مراد حقیقی مملکت بھی ہے اور صرف واقعی بھی مثلاً باغی علاقہ۔ قاعدے کا لفظ بھی عام ہے یعنی قانون، رواج، معاہداتی پابندی وغیرہ سب اس میں شامل سمجھے جائیں۔ تمدن سے مراد ظاہر ہے کہ یوروپی مولفوں کے نزدیک جدید مغربی تمدن ہے اور کسی قوم خاص کر غیر یوروپی قوم کے لئے اپنے آپ کو متمدن منانے کے لئے قوت کی حقیقی ضرورت ہے اس کو بیان کرنے سے ہمیشہ گریز کیا جاتا رہا ہے

ہر مولف اپنی تعریف الگ دیتا ہے اور دوسروں کی خامیاں بتاتا ہے۔ لارنس کی اوپر دی ہوئی تعریف بھی بے داغ نہیں مثلاً یہ کہا گیا کہ "مملکتوں کے برتاؤ" کا لحاظ ہے لیکن ہمارے مبحث میں مملکت سے ہی نہیں بعض وقت اس کی رعایا سے بھی بحث ہوتی ہے مثلاً جنگ چھڑنے پر ایک حربی کی رعایا دوسرے

کے علاقے میں ہو تو اس کی نظر بندی، اخراج وغیرہ یا غیر جانبدار مملکت کا فریقین جنگ کی فوجوں کو اپنے علاقے میں آکر لڑنے سے جبراً روکنا یا حربی ملک کی رعایا کی خانگی تجارت کو متاثر کرنا وغیرہ۔

اسی طرح اس تعریف سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ بعض قاعدے ہمہ گیر ہوتے ہیں اور بعض، خاص کر معاہداتی واجبات کے محدود حلقے پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ مہذب ممالک، غیر مہذب مملکت سے معاملت کرتے وقت جو برتاؤ اختیار کرتے ہیں اُس کو قانون بین الممالک سے خارج کر دینا اور مقتضائے انسانیت قرار دے کر ایک اخلاقی قاعدہ قرار دینا، یہ البتہ تعریف کا قصور نہیں بلکہ مغربی نقطۂ نگاہ اور اعتقاد کا ہے۔

ف (۱۴) اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عرب مولف اس علم کو "سیر" کا نام دیتے رہے ہیں۔ بنتھم کی بنائی ہوئی اصطلاح "انٹرنیشنل" اتنی عام پسند ہو گئی ہے کہ اب فرانسیسی، اطالوی، اسپینی وغیرہ میں اسی کا ترجمہ کر لیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح اس زمانے کی ہے جب ہر مملکت ایک "قوم" ہوتی تھی اور قوم سے صرف سیاسی قوم مراد ہوتی تھی نسل، زبان اور جغرافیائی امور کا لحاظ نہیں تھا۔ اب تصورات بدل چکے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ ایک قوم کی دو مملکتیں ہوں، یا دو قوموں کی ایک ہی مملکت ہو۔ اور انگریزی لفظ "نیشن" قدیم اور جدید دونوں معنوں کے لئے برتا جاتا ہے۔

ہمارے مضمون میں قوموں سے بہ حیثیت قوم کوئی بحث نہیں ہوتی ہمیں صرف مملکتوں سے سروکار ہے اس لئے اگر اصطلاح کا ترجمہ ہی کرنا ہے تو صحیح مفہوم

ادا کرنے والا لفظ زیادہ بہتر ہوگا۔ ہندوستانی صحافت نگاروں میں جو ہمارے مضمون سے محض ناواقف رہے ہیں، "بین الاقوام" کا لفظ چل پڑا ہے۔ ہمارے ایک سابق پروفیسر نے لفظی ترجمے کی دھن میں صرف و نحو کی بھی پرواہ نہ کر کے انٹرنیشنل کے لئے "بین قومی" کا محاورہ برتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہماری مجوزہ اصطلاح "بین الممالک" زیادہ بہتر سمجھی جائے کیونکہ اس قانون میں قوم ہو یا نہ ہو نہیں بلکہ مملکتوں کے آپس کے برتاؤ سے بحث ہوتی ہے۔ اگر قوم کو کسی ملک کی رعایا کا مجموعہ بھی مان لیا جائے تو ہمیں اس سے نہیں بلکہ اس کی ہیئت حاکمہ سے بحث ہوتی ہے خاص کر اس کے سرکاری برتاؤ سے۔

۱۴۷ ایک بات البتہ صاف کر دینی ہے کہ لفظ قانون کے معنے دو ہوا کرتے ہیں:۔

۱۔ وہ قاعدے جن کو کوئی اعلا اقتدار اپنے ماتحتوں کے لئے بناتا ہے اور ان کی بہ جبر تعمیل کراتا ہے۔

۲۔ وہ قاعدے جن کے مطابق کوئی طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے۔

یہاں دوسرے اور وسیع تر معنے ہی ملحوظ ہیں کیونکہ اب تک یہ بات ممکن نہیں ہوئی ہے کہ دنیا کی تمام مملکتیں کسی مشترکہ برتر اقتدار کے ماتحت آجائیں گو یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی طرح انگریز اور بعض دیگر مغربی قومیں قانون بین الممالک کو اپنے قانون ملکی ہی کا جز سمجھتی ہیں اور اسے ان لکھا قانون ہی مانتی آئی ہیں۔

۱۴۸ ایک تاریخی واقعہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہر خود مختار سلطنت اپنا

قانون بین الممالک خود بناتی ہے۔ اس سلطنت کے تمدنی اور سیاسی اثر کی جوں جوں ترقی ہوتی اور وقار قائم ہوتا ہے، اس کا قانون اتنا ہی زیادہ وسیع حلقے میں مقبول ہو جاتا ہے۔ جدید مغربی قانون بین الممالک اصل میں مغربی یورپ میں پیدا ہوا لیکن رفتہ رفتہ پورا یورپ، پھر امریکا اور پھر مشرقی ممالک بھی اس میں شریک ہوتے جا رہے ہیں گو اسپین وغیرہ کے کم مہذب یورپی علاقوں میں اب بیسویں صدی کے ثلث دوم میں بھی آدمیوں کو جلاتا اور بے قصور یرغمالوں کو قتل کرتا مروج ہے یا ممالک متحدہ امریکا میں "لینچنگ"، یہ جس کا مرادف لفظ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ اب بھی تجزیہ عمل کیا جاتا ہے۔

۱۹ جس چیز کے ذاتی یا عرضی امور سے کسی علم میں بحث کی جاتی ہے وہ چیز اس علم کا موضوع کہلاتی ہے۔

قانون بین الممالک کے موضوع یہ ہیں:۔

۱۔ ہر مقتدر مملکت۔

۲۔ ہر وہ جزوً مقتدر مملکت جسے خارجہ تعلقات کی کسی نہ کسی حد تک آزادی ہو۔

۳۔ نیابتیں۔

۴۔ باغی۔

۵۔ مستامن۔

۶۔ مجلس اقوام۔

ان کی کچھ تفصیل ضروری ہوگی۔

۲۰ مملکت سے مراد یہ ہے کہ جب لوگ کسی ملک میں خود اپنی حکومت کے تحت بس جائیں جو داخلی اور خارجی تمام معاملات میں خود مختار ہوں۔ غرض انسانی آبادی کے لیے کسی زمین اور علاقے کا ہونا ضروری ہے۔ خانہ بدوش قبائل یا ایسی ٹولیاں جو کسی علاقہ میں جم کر نہ رہتی ہوں مثلاً بنی اسرائیل جب فرعون کے

ظلم سے بیزار ہو کر مصر سے بھاگ نکلے اور صحرائے سینا میں چالیس سال تک بھٹکتے رہے، مملکت نہیں سمجھے جا سکتے۔ اگرچہ ہزار بڑے بڑے، آدمیوں سے بھرے ہوئے جہاز مثلاً بحر الکاہل میں بکب جا رہے ہیں اور ان کا انتظام خود مختار ہو تو بھی یہ مشتبہ ہے کہ ان کو مملکت کہا جائے گا۔

۳۱ھ خود مختاری کے معنے غیر محدود آزادی کے نہیں ہیں کیونکہ معاہدات کی بنا پر یا اور طور سے کسی خود مختار مملکت پر عارضی یا دائمی پابندی عائد ہو سکتی ہے مثلاً شمالی اور جنوبی امریکا کی آزاد مملکتیں مقولہ منرو کے تحت ممالک متحدہ امریکا کے تحت ہیں اسی طرح چونکہ حقوق کے ساتھ فرائض بھی ناگزیر ہوتے ہیں اس لیے ایک خود مختار مملکت کو دوسری مملکت کی خود مختاری کے خلاف عمل کی بھی آزادی نہیں ہوتی ورنہ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ قانون بین الممالک کے اغراض کے لئے خود مختاری کا معیار صرف خارجہ تعلقات کی آزادی ہے مستقل طور سے اور ہمیشہ کے لئے غیر جانب دار بنائی ہوئی مملکتیں بھی جب چاہیں حقوق سے دست بردار ہو کر اپنی خود مختاری کو کام میں لا سکتی ہیں لیکن جب تک وہ غیر جانب دار بنائی ہوئی رہیں، جارحانہ جنگ کرنے کی انھیں آزادی نہیں رہتی اور ایک معنے میں وہ جزءً مختار ہوتی ہیں مکمل خود مختار نہیں۔

۳۲ھ مملکت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ اکیہری یا فردیہ اور دوہری یا مرکبہ۔ فردیہ جمہوریت بھی ہو سکتی ہے، اعیانیت بھی، شاہی بھی شہنشاہی بھی، دستوری بھی اور استبدادی بھی۔ طالسٹائی کے مزاج سے البتہ ہمیں بحث نہیں ہیں "کسے را با کسے کارے نہ باشد"، اور کسی حکومت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی نیز اس

ایک جمہوریت ہے، جاپان، ایران، افغانستان، حجاز، عراق اور مصر شاہی ہیں۔ مغلیہ سلطنت ایک شہنشاہت تھی۔ برطانیہ اور آج کل کی اکثر خود مختار سلطنتوں میں دستوری حکومت ہے۔ جدید ترکی، اٹلی اور جرمنی کو دستوری کہیں یا استبدادی، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کی بحث میں نہ پڑنا ہی بہتر ہے۔

مرکب مملکتوں کی بہت سی قسمیں ہیں اور ان کا کسی تقسیم میں حصر کرنا ممکن نہیں ان کی قسموں کی جگہ ان کے چند اہم ہوتے یہاں پیش کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ "انضمام" سے مراد لارنس نے یہ لیا ہے کہ دو یا زیادہ خود مختار سلطنتیں کسی خاص وجہ سے مل کر بین الممالک اغراض کے لئے ایک ہو جائیں مثلاً ۱۷۰۷ء میں اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ ایک ہی بادشاہ کے تحت ہو گئے، جس طرح موجودہ کشمیر اور جموں، یا اننگ پال کے مرنے پر دہلی کی حکومت اس کے داماد راجہ پرتھی راج کی حکومت میں ضم ہو گئی تھی[۱]۔ مگدھ کے راجہ کو کاشی کی ریاست بیوی کے جہیز میں ملی تھی[۲]۔ بھوپال کی ولی عہد کا نکاح ریاست کوروائی کے ولی عہد سے ہوا ہے۔ ان کا لڑکا دونوں ریاستوں کا "ولی عہد و لی عہد" ہے۔

۲۔ عملی اتحاد سے مراد یہ ہے کہ ایک مشترک حکمران کے ماتحت دو ریاستیں ہوں جو اندرونی معاملات میں ایک دوسرے سے بالکل خود مختار رہوں البتہ ان کے خارجہ تعلقات اس مشترکہ حکمران کی جانب سے متحدہ طور سے قائم ہوں۔ ایسی اب کوئی سلطنت باقی نہیں ہے ۱۹۱۸ء تک آسٹریا ہنگری ایسی

---

[۱] تاریخ ہند نصاب میٹرک جامعۂ عثمانیہ صفحہ ۶۳۔ [۲] ایضاً صفحہ ۱۹۔

ہی ڈہری شہنشاہی تھی۔ سنہ ۱۸۱۴ء کے بعد سے سویڈن اور ناروے بھی ایسے ہی تھے اور سنہ ۱۹۰۵ء میں معاہدۂ کارل اِسٹاڈ کے بعد دونوں الگ ہو گئے۔

۳۔ وفاق (فیڈریشن، یونائٹڈ اِسٹاٹ) سے مراد چند ریاستوں کا اتحاد ہوتا ہے جو خارجہ تعلقات کے لئے مشترکہ ادارہ قائم کرتی ہیں اور اندرونی معاملات میں ہر ریاست کم یا زیادہ خود مختار ہوتی ہے گو مرکزی حکومت کو (جو ان وفاقی وحدتوں ہی کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے) بہت سے اختیار دیدئے جاتے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکا، سوئٹزرلینڈ، اس کی پرانی مثالیں ہیں۔ ہندوستان میں بھی اب اسی طرح کے اتحاد کی کوشش ہو رہی ہے جس سے گوا وغیرہ کے پرتگالی اور پھلچری (پانڈیچری) وغیرہ کے فرانسیسی مقبوضات غالباً الگ ہی رہیں گے۔ اتحاد شوراے روس بھی وفاق ہے اور ساتھ ہی اشتراکی نظام رکھتا ہے۔

۴۔ شخصی اتحاد کی بھی کوئی مثال باقی نہیں رہی سنہ ۱۷۱۴ء سے سنہ ۱۸۳۷ء تک انگلستان کا بادشاہ ہانوفر کا الکٹر[1] (صدر) بھی ہوتا تھا۔ اس شخصی اتحاد کو چھوڑ کر ان علاقوں میں سے ایک کو دوسرے کی حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۵۔ عہدیہ (کنفڈریشن) ان ریاستوں کے اتحاد کو کہتے ہیں جو (وفاق کی طرح) اپنی ایک مشترکہ مرکزی حکومت بھی قائم کرتی ہیں لیکن ان ریاستوں میں سے ہر ایک یا چند یا کسی ایک کو خارجہ تعلقات کی محدود آزادی بھی حاصل رہتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ[1] کا اتحاد شروع میں ایسا ہی تھا مگر سنہ ۱۸۴۷ء سے خارجہ

عل[1] تلفظ کے لئے کتاب کے شروع میں "املا اور اعراب" پڑھئے۔

تعلقات کا اقتدار ریاستوں سے لے کر پوری طرح مرکز کو دے دیا گیا۔ سنہ ۱۸۱۵ء سے جرمنی میں بھی یہی حال رہا اور وہاں کے خارجہ تعلقات کی مجلس فرانکفورٹ میں اجلاس کیا کرتی تھی۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں اتحاد زیادہ مستحکم ہو گیا گو ریاستوں کو پھر بھی علاحدہ سفارت کا اختیار رہا۔ علاحدہ معاہدوں کی بھی اس شرط سے اجازت رہی کہ مرکزی حکومت کے سپرد جو فرائض کئے گئے ہیں ان کے متعلق ریاستوں کو معاہدہ کرنے کی اجازت نہیں رہے گی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں دستور فائمار نے جرمنی کو جمہوریت بنا دیا مگر ریاستوں کا خارجہ تعلقات کا سابقہ اختیار باقی رہا البتہ ان معاملات کے معاہدوں کے لئے مرکز کی منظوری کی شرط بڑھا دی گئی۔ باویریا کے صدر مقام میونک میں فرانسیسی سفیر بھی حال حال تک رہا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۳۳ء کے نازیسی دستور سے اس کا بھی خاتمہ ہو گیا اب جرمنی کو عہدیہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ برطانوی ہند اور حیدرآباد کا اتحاد بھی اس قسم کا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ مفصل بحث ہو گی۔ (دیکھئے ۲۵۹)

۴۱۔ زوال پذیر اتحاد سے میں یہ مراد لیتا ہوں کہ کسی بڑی اور وسیع سلطنت کے انحطاط کے زمانے میں اس کے مختلف اجزاء میں خودمختاری بڑھتی جاتی ہے۔ گو برائے نام وہ پھر بھی مرکزی حکمران کو اپنا حاکم اعلیٰ مانتے ہیں۔ مثلاً خلافت عباسیہ کے متاخر زمانے میں اس کے مختلف صوبے مصر، حلب وغیرہ کی صوبہ داریاں موروثی اور خودمختاری ہو گئی تھیں۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ (ترکی) کے صوبے یونان، بلغاریہ، مصر، قبرص، سربیا، مونٹی نگرو، رومانیا، البانیا وغیرہ۔ یا سلطنت مغلیہ کے ساتھ صوبہ دار دکن کے تعلقات کہ سنہ ۱۸۵۷ء تک حیدرآباد میں جانشینی موروثی تو ہو گئی تھی مگر سند

دہلی سے آتی تھی اور سکے اور خطبے میں مغل شہنشاہی کا نام لیا جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں شاید خود برطانوی قلمروؤں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے قانون پیٹر ویسٹ منسٹر کے بعد سے آئرلینڈ، کاناڈا، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، جنوبی افریقا اور بڑی حد تک خود ہندوستان کے تعلقات لندن کی حکومت سے ایسے ہی ہیں۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء سے تو آئرلینڈ کے دستور سے بادشاہ کا نام اور گورنر جنرل کا عہدہ دونوں حذف کر دئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہی وہاں کی پارلیمان میں حلف لیتے وقت بادشاہ کی وفاداری کا ذکر نکال دیا گیا ہے۔

جزء مقتدر مملکتیں

ف ۲۳ جب کوئی مملکت کسی دوسری مملکت کی اس طرح ماتحت ہو کہ خارجی تعلقات کا اختیار بالکل باقی نہ رہے تو معاہدۂ ماتحتی کو چھوڑ کر ایسی ماتحت مملکت کی دوسری باتوں سے قانون بین الممالک میں بحث نہیں ہوتی گو اس قسم کی بعض بڑی عجیب مثالیں ملتی ہیں مثلاً ہز ہائینس سلطان سکلا (متحرہ حیدرآباد) میں ایک موروثی جمعدار نظم جمعیت اور جاگیردار ہوتے ہیں۔ ہز ہائینس مہاراجہ اندور حیدرآباد کے ضلع بیدر کے مواضع پارنہ دیال گاؤں کے موروثی پٹیل ہیں اور سنہ ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد کے محکمۂ مالگذاری نے اس تعلق کو ختم کرنا چاہا تو دربار ہولکر کی باصرار درخواست پر کہ یہ بزرگوں کی نشانی ہے حسب فرمان خسروی مورخہ ۱۸ ذی حجہ سنہ ۱۳۱۴ھ ان کے حقوق کی حفاظت منظور کی گئی۔ بعض مہاراجگان راجپوتانہ و ہندیل کھنڈ مثلاً جے پور، جودھپور، بیکانیر وغیرہ کی جاگیریں اور انعام

حیدر آباد کے صوبہ اورنگ آباد میں ہیں اور اُن کے نائب عیدین کے موقع پر صوبہ دار (گورنر) اورنگ آباد کو نذر پیش کرتے ہیں۔ یہ علاقے مغلیہ سلاطین کے عطا کردہ ہیں۔ حال میں استحقاق دفینہ، مقدمات عدالتی، جانوران جنگاری، قبرستان، مرگھٹ وغیرہ کے متعلق اختیار سماعت کی بحث ہوئی تھی اور حکومت حیدر آباد کے اس استدلال کو ان انعام دار راجاؤں اور حکومت برطانوی ہند نے بھی تسلیم کیا کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی حدتک حکومت حیدر آباد حقوق و فرائض کے لئے حکومت مغلیہ کی جانشین ہے اور اب ان انعامداروں کو حکومت حیدر آباد کے ساتھ مساوات کا حق نہیں۔ قانون ملک کی طرح قانون بین الممالک کسی شخص کو دو حیثیتوں میں دو الگ شخص مانتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی ایک جگہ مملکت کا حکمران ہو اور دوسری مملکت میں محض رعیت، (جس کے باعث اس پر معمولی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جا سکے گا گو اس کی اپنی مملکت میں نیز اپنی علاقوں میں اس کو شاہی مراعات حاصل رہیں گے) یہاں پر مسئلہ بنام سلطان جوہور کے مقدمے کے انگلستانی فیصلے کا ذکر غیر متعلق نہ ہوگا۔ جسٹس کرنے اس مقدمہ میں فیصلہ کیا ہے کہ: — "سلطان نے ممالک غیر سے معاہدہ نہ کرنے کا جو عہد کیا ہے میری رائے میں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سلطنت نے معاہدہ کرنے کا حق ہی زائل کر دیا ہو بلکہ یہ صرف اس بات کی شرط ہے کہ برطانیا ان کی حفاظت کرے۔ اگر سلطان اپنے عہد کو نظر انداز کرنا چاہیں تو حفاظت برطانیا کو ہاتھ سے کھو دیں گے یا ممکن ہے کہ برطانیا کے ساتھ دیگر مشکلیں پیدا ہوں لیکن میری رائے میں سلطان کے معاہدے میں ہرگز کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے

سلطان جمہور کے خود مختار مقتدر اعلا (انڈپنڈنٹ ساورین) ہونے پر کوئی قید عائد ہو یا وہ خود مختار مطلقاً تسلیم نہ کئے جائیں"۔ (اسکاٹ صفحہ ۲۸۴)۔

ف ۲۴۔ قانون بین الممالک میں کسی جزء مقتدر مملکت سے صرف اسی وقت بحث ہوگی جب اسے خارجہ تعلقات کی کچھ نہ کچھ آزادی ہو۔ اس کی دو بڑی قسمیں قرار دی جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ جس متولی مملکت کے سپرد خارجہ تعلقات کے اقتدار کا کچھ حصہ کیا گیا ہے اس میں خود اس ماتحت مملکت کو بھی دخل ہو جیسے عہدیہ میں ہوتا ہے۔

دوسری یہ کہ متولی مملکت کے انتظام میں اس کو کوئی دخل نہ ہو۔

عہدیہ (کانفڈریشن، اِشٹاٹن بُونڈ) کا اوپر ف ۲۳ میں ذکر آچکا ہے۔ کسی عہدیہ کی وحدتیں یا ریاستیں جزء مقتدر ہوتی ہیں مگر اقتدار کا بقیہ حصہ بھی جس ادارے کے قبضے میں ہوتا ہے اس میں ایسی ہر وحدت برابر کی حصہ دار اور شریک ہوتی ہے۔

دوسری قسم کی ایک مثال تو وہ ہے جو زوال پذیر اتحاد کے ضمن میں بیان کی گئی۔ انحطاط پذیر سلطنت کے جو اجزا ہوتے ہیں وہ مکمل خود مختار نہیں جزء مقتدر ہوتے ہیں۔ اس قسم کی ایک اور صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی کمزور مملکت پر کوئی دوسری قوی مملکت اپنا اثر جمانا شروع کر کے آہستہ آہستہ اختیارات سلب کرنے لگتی ہے مثلاً سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک کوریا پر جاپان کی نوبت قائم رہی گو کوریا کی شہنشاہت کو بھی برقرار رکھا گیا۔ پھر بعد میں جاپان میں ضم کر لیا گیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ متولی ایک سے زیادہ ممالک ہوں اور ایک مملکت کئی مملکتوں کی ماتحت ہو۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کے زمانے میں

مسلمانوں نے سنہ ۲۸ھ میں جزیرہ قبرص فتح کیا پھر اس شرط پر وہاں کی حکومت سے صلح کی کہ وہ:-

۱۔ حکومت اسلامیہ کی باج گزار رہے۔

۲۔ مسلمانوں کو کوئی عذر نہ ہوگا اگر وہ حسب سابق بیزنطینی سلطنت کی بھی باج گزار رہے۔

۳۔ اسلامی حکومت کے راز اس کے دشمنوں پر فاش نہ کرے لیکن بیزنطینی سلطنت کی کارروائیوں سے مسلمانوں کو باخبر رکھے۔

زمانۂ حال میں بھی ایسی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں کہ ایک سے زاید ممالک کسی مملکت یا اس کے کسی جزو پر اپنا اثر جمالیں گو عموماً آخر میں یہ متوالی سلطنتیں حصے بخرے کر لیتی ہیں اور کل پر مشترکہ اثر رکھنے کی جگہ اجزا پر منفردہ اثر رکھنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ مراکش کے شمال میں طنجہ (ٹانجیر) پر اب بھی بین الممالک اثر ہے۔ اسی طرح مراکش ایک ہی سلطان کے ماتحت ہے مگر اس کا کچھ حصہ اسپین کے تحت ہے اور کچھ حصے پر فرانس کا بول بالا ہے۔

حیدرآباد کی حیثیت قانون بین الممالک میں

۱۲۵) یہ مختلف زمانوں میں بدلتی رہی ہے سلطنت مغلیہ کے شروع کے زمانے سے ہم فی الحال بحث شروع کریں گے جب کہ وہ سلطنت کا محض ایک صوبہ تھا اور دہلی سے وقتاً فوقتاً صوبہ دار (گورنر) وہاں بھیجے جاتے تھے۔ دہلی میں مرکزی حکومت کی ابتری اور جا و بیجا مداخلتوں اور دہلی کے بادشاہ گروں کی فوج کشی

سے مجبور ہو کر صوبہ دار آصف جاہ نے (آصف جاہ اول کی حیثیت سے ۲۹ رجب ۱۱۳۶ھ کو اپنی عملی خود مختاری کا اعلان کیا۔ البتہ اور خود مختار شدہ صوبوں کے برخلاف مغلیہ سکہ اور خطبہ ہی اپنے علاقے میں جاری رکھا اور وارن ہیسٹنگز کی استدعا کے باوجود شہنشاہی کا خطاب برتنے سے انکار کیا۔ نادر و ابدالی کے حملوں کے وقت تن من دھن سے دہلی کی مدد کی بلکہ جانشین کی منظوری بھی دہلی کے لال قلعے ہی سے منگائی جاتی تھی اس کے بعد جو طوائف الملوکی اور لاقانونی کا راج شروع ہوا اس میں ہمسایوں کے تعلقات نے اس بات پر مجبور کیا کہ ۱۷۹۸ء میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" اور حیدرآباد بعض ممالک سے تعلقات کی حد تک باہمی مشورے کی پابندی منظور کریں اور ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں "نظام حیدرآباد" ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی "حکومت" سے اس بات کا معاہدہ کریں:

"موجودہ معاہدے سے دونوں مملکتوں کا اتحاد اور دوستی اس قدر مضبوطی سے جڑ گئے ہیں کہ ان کو ایک ہی قرار دیا جاسکتا ہے اس لئے "ہز ہائینس دی نظام" اپنے آپ کو پابند کرتے ہیں کہ آئندہ کسی بھی"

ملے جریدۂ غیر معمولی حیدرآباد بسلسلہ جشن دو صد سالہ سالگرہ خود مختاری مورخہ یکم شعبان ۱۳۴۲ھ ۔ ملے ۲ کسفرڈ ہسٹری آف انڈیا مولفہ اسمتھ ص۔۔۔ چونکہ جب تک چند بادشاہ کسی کو شہنشاہ تسلیم نہ کریں کسی شخص کا شہنشاہ کہلانا منطقی طور سے ممکن نہیں اس لئے ۱۹۱۱ء میں دہلی کے دربار تاج پوشی میں قیصر ہند کی جانب سے حضور نظام (آصف جاہ ششتم) کو ہز مجسٹی کے خطاب سے مخاطب کیا جانا طے ہو گیا تھا لیکن اس سے چند ماہ قبل آصف جاہ ششتم کا انتقال ہو گیا۔ اگر ان کے جانشین کے حقوق کیلئے حکومت حیدرآباد نے اصرار نہ بھی کیا تو یہ قیصر ہند کی حکومت ہی کا فریضہ تھا کہ اپنی کارروائیوں میں منطقی معقولیت باقی رکھنے کی کوشش کرتی۔ ملے بانکر (انڈین اسٹیٹس) ص ۱۱، ۱۲۶ بحوالہ رنگناتھ بیا جیس

"سلطنت سے کوئی گفت و شنید نہ تو شروع کریں گے اور نہ جاری"
"رکھیں گے جب تک کہ معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیشگی اطلاع دیکر"
"باہم مشورہ نہ کرلیں اور معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اپنی جانب"
"بذریعہ ہاذا اعلان کرتی ہے کہ اسے ہز ہائنس کے بچوں، رشتہ داروں"
"رعایا یا ملازمین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی حد تک"
"ہز ہائنس مختار مطلق ہیں" (اسپیس ص ۵) ۔

اس معاہدے سے جو آج بھی نافذ ہے، خارجہ آزادی محدود تو ہو گئی لیکن سلب نہیں ہوئی۔ دوحلیفوں میں باہمی مشورے سے مشترکہ خارجہ پالیسی مقرر کرنے کا کافی رواج ہے (چنانچہ حال میں سعودی عرب اور یمن میں بھی یہی ہوا ہے۔ اسی طرح ترکی، افغانستان اور ایران نے جنگ اور صلح میں متحدہ طور سے شریک رہنا منظور کیا ہے) اگر اسے ماتحتی کہتے ہیں تو ۱۷۹۸ء کے معاہدے کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بعض خارجہ ممالک سے تعلقات متعین کرتے وقت حیدرآباد سے مشورہ کرنا منظور کیا تھا۔ کیا وہ بھی ماتحتی تھی؟

اسی اثنا میں اور اس کے بعد بھی بہت سے وسیع علاقے مثلاً شمالی سرکاریں، اضلاع مفوضہ اور برار وغیرہ فوجی امداد کے لئے بطور "انعام" جاگیریں دئے گئے یا یوں ہی انتظام میں تفویض کئے گئے یا فوجی اخراجات کے لئے گروی رکھ دئے گئے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ حیدرآباد ان علاقوں میں اپنے اقتدار اعلا کے نفاذ، اور ڈاک، سکے، عدالتی اختیارات سماعت وغیرہ کا مطالبہ کرے۔

۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء میں "تاجروں کی حکومت" کی بڑھتی ہوئی ہوس اور منفعت ستانی کو ناقابل برداشت پاکر ہندوستان میں ہر جگہ جو شورش اور جنگ حریت طلبی ہوئی، اس کا اختتام ایک طرف افغانستان کی دوستی اور دوسری طرف حیدرآباد کی مدد سے قضا و قدر کے باعث مغلیہ "شہنشاہ" کا نام بھی مٹا کر ہوا اس لئے ادھر سے حیدرآباد کی جو خود عائد کردہ رضاکارانہ اور اخلاقی پابندیاں تھیں وہ تو ختم ہوگئیں لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز تاجروں کو اتفاقات زمانہ نے جو وسیع علاقہ تسلط میں دیدیا تھا اس کو معاوضہ دے کر (جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے) انگلستان کے بادشاہ نے حاصل کرلیا اور وہ سب حقوق و فرائض اپنی طرف راست طور سے منتقل کر لئے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل تھے۔

کسی فرد رعیت کے لاوارث مرنے پر اس کا ترکہ جس طرح قانون ملک کی رو سے بحق سرکار ضبط ہو جاتا ہے، اسی کی توسیع کر کے ڈلہوزی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کا جائز حکمران اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے بادشاہوں اور راجاؤں کو جو کمپنی کے آوردے ہوں ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی رعایا قرار دیا اور ساتھ ہی ان ریاستوں کو ان بادشاہوں یا راجاؤں کی خانگی جائداد۔ اولاد نہ ہونے کی صورت لے پالک کو ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کر کے ایسی لاوارث ریاستوں کا ایسٹ انڈیا کمپنی سے الحاق شروع ہوا۔ اور کثرت سے ضبطیاں عمل میں آئیں اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حلیفوں میں جو بے چینی پیدا ہوئی وہ بھی ۱۸۵۷ء کی خونریزیوں کی

بڑی حد تک ذمہ دار تھی "وہ تاجروں کی حکومت" کے خاتمے پر اس سے سبق لے کر اس خود ساختہ حق غصب سے بالآخر دست برداری دی گئی اور ماتحت اور حلیف تمام ہندوستانی ریاستوں کے فرماں رواؤں کی خدمت میں ایک ہی نمونے اور الفاظ کا ۱۸۶۲ء میں ایک اقرار نامہ بھیجا گیا جو رسمی دربار میں انگریزی سفارتی افسروں نے ان حکمرانوں کی خدمت میں پیش کیا۔[1]

نشانِ موہوم گرام

"ملکہ معظمہ کی خواہش ہے کہ ہند کے مختلف رؤسا اور حکمران"

"اپنے جن علاقوں پر حکومت کرتے ہیں وہ سدا برقرار رہیں"

"اور نیز ان کے گھرانوں کی نمائندگی اور عظمت باقی رہے"

"اسی بنا پر میں اس خواہش کی تکمیل میں آپ کو یقین دلاتا"

"چاہتا ہوں کہ اگر آئندہ حکمران کو اولاد صلبی نہ ہو تو شرع"

"اسلام کے لحاظ سے جو صحیح حق دار ہو گا وہی جانشین ہو گا"

"یقین فرمائیے کہ آپ سے کیے ہوئے اس عہد کو کوئی چیز"

"نہ توڑ سکے گی جب تک کہ آپ کا گھرانہ تاج کا وفادار اور"

"معاہدوں، عطیوں اور عہدوں کا جن سے برطانوی"

---

[1] یہ دستاویز ایچیسن کے مجموعۂ معاہدات جلد پنجم میں انگریزی میں ہے۔ اصل فارسی سند کی نقل کے لئے حیدرآباد کی رکارڈ آفس کے علم دوست ناظم مولوی سید خورشید علی صاحب کا ممنون ہوں۔

"حکومت پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم پابند رہے"۔

شر حد ستخط

کیننگ۔ ۱۱ مارچ ۱۸۶۲ء

ہدایتہً یہ اطمینان دہانی یک طرفہ چیز ہے جس سے مکتوب الیہ پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے کہ "تاج سے وفاداری" کے حوالے جو ماتحت ریاستوں کے لئے موزوں تھا، حیدرآباد نے فوراً کوئی توجہ نہیں دلائی تھی کیونکہ ۱۹۲۶ء میں برار کے جھگڑے کے موقع پر لارڈ ریڈنگ گورنر جنرل نے اسی اطمینان دہی کو اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا تھا کہ قیصر ہند کا فیصلہ دیسی ریاستوں کے لئے بھی امر منفصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اطمینان دہانی کو "سند" کہنا بھی جیسا کہ لارڈ ریڈنگ کو اصرار ہے محل نظر ہے۔ اصل دستاویز میں لفظ سند نہیں ہے۔ بعد میں انگریز بدلتی یہ خط لکھے کہ اسے سند تصور کیا جائے، تو اس سے اس کی حیثیت بڑھ نہیں جاتی یوں بھی۔ جیسا کہ فروری ۱۹۳۰ء میں نریندر امنڈل (ایوان رؤسا) نے مہاراجہ پٹیالہ کی کوشش سے جو قرار دادیں منظور کیں (دیکھئے پانکر کی کتاب انڈین پرنسیز ان کاونسل ص ۲۹ تا ۳۱ مطبوعہ ۱۹۳۶ء) ان میں سے پہلی اور ساتویں قرار داد کے مطابق ــــ کسی مملکت کو کوئی ایسا حق بذریعۂ سند دینا جو اسے خود بخود ہی حاصل ہو، اس بات کے مرادف نہیں کہ وہ حق سند دہندہ نے عطا کیا۔ اور اس طرح کی سند سے موجودہ معاہدے اور پابندیاں کالعدم نہیں ہو جاتیں۔ دیسی ریاستوں اور حکومت برطانیا کے تعلقات یا تو معاہدات

موجودہ پر مبنی ہو سکتے ہیں یا ان رواجات پر جو "باہمی رضامندی" سے قائم کیے جائیں۔

لارڈ ریڈنگ کے دوسرے استدلال یہ تھے:۔

۱۔ حیدرآباد کی جانشینی کو تسلیم کرنا حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ دیسی ریاستوں میں برطانیہ کو، بطور "اقتدار برتر"، کے، مداخلت کا حق حاصل ہے۔

حضور نظام نے فوراً ان دعووں کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اپنا حق احتجاج محفوظ رکھا۔ یوں بھی ظاہر ہے کہ ہر ملک میں کوئی نیا حاکم منتخب ہوتا ہے تو اس کی اطلاع ہونے پر ہمسایہ اور دوست ممالک اس کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں۔ تسلیم کرنے اور اجازت دینے میں بہت فرق ہے۔ حیدرآباد میں تخت نشینی کے لئے آج تک برطانوی حکومت کی اجازت نہیں لی گئی۔ موجودہ حکمران آصفجاہ سابع کی تخت نشینی کے وقت بے شک بعض لوگوں کی خواہش تھی کہ انگریزی رزیڈنسی سے استمزاج کر لیا جائے لیکن مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد اور بعض دیگر امرا خاص کر شہاب جنگ مرحوم کے زور دینے پر عمائد سلطنت نے خود تخت نشینی اور بیعت کر کے اطلاع شائع کی۔ مداخلت بھی حیدرآباد میں اب تک کبھی نہیں ہوئی۔ جب کبھی حکومت برطانیہ کو کوئی ضرورت معلوم ہوئی تو ہمیشہ "مشورے" کے نام سے توجہ دلائی جاتی رہی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد شاہ برطانیہ نے حضور نظام کو "حلیف صادق حکومت برطانیہ" کا خطاب فل لائی

آف دی برٹش گورنمنٹ) کے نام سے خطاب کرنا شروع کیا ہے، جو وائسرائے ریڈنگ کے انکار کے باوجود ہمارے خیال میں حیدرآباد کی بین الممالک حیثیت کو واضح کرنے کے لئے اچھا معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاہ برطانیہ کے خطاب "قیصر ہند" سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اگر اس خطاب کو با معنا قرار دینے کی کوشش کی جائے تو فوراً فرانس، پرتگال اور نیپال نیز بھوٹان سے اعلان جنگ کرنا ہوگا، جن کے علاقے ہندوستان میں ہیں۔ صرف شہر گوا کے مالک پرتگال بھی کسی زمانے میں اپنے کو "ہندوستان اور اس کے سمندروں کا شہنشاہ" لکھا کرتے تھے۔ جہانگیر، شاہ جہاں، عالم گیر، شاہ عالم اور جہاندار بھی خطاب رہے ہیں لیکن شرمندۂ معنا نہیں۔ چاروں طرف برطانوی ہند سے گھرا ہوا ہونے سے بھی کوئی اثر نہیں پیدا ہوتا۔ جمہوریۂ سان مارینو، اٹلی کے اندر ہے اور اسپینی صوبہ لیفیا، فرانس کے اندر ہے۔

۲۶۵ موروثی جاگیرداریوں اور زمینداریوں کو خارج کر دیں تو ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی تعداد (۲۳۵) اور ان کا رقبہ کل ہندوستان کا تقریباً (⅖) ہے۔ یہ ریاستیں چوطرف پھیلی ہوئی ہیں بعض کی سرحد کسی دوسری ریاست سے ملتی ہے تو بعض کے چاروں طرف برطانوی ہند ہی کا علاقہ ہے۔ بعض مثلاً بنکاپہاڑی کا رقبہ صرف پانچ مربع میل ہے تو بعض مثلاً حیدرآباد و برار کا بہ استثنائے شمالی سرکار و اضلاع مفوضہ کوئی ایک لاکھ مربع میل۔ لیکن معاہدات کے لحاظ سے سبھوں نے خارجہ تعلقات کے حق سے دست کشی اختیار کر لی ہے سوائے حیدرآباد اور کشمیر کے۔ خارجہ تعلقات کے حق سے دست کشی کے اقرار کا اثر مکمل بنام

سلطان آف جوہور کے مقدمے میں (دیکھو ادیرہ ۱۳۳) واضح کیا گیا ہے۔
حیدر آباد نے بھی اپنی آزادی کو محدود اور برطانیہ کو اطلاع دینے اور مشورہ
کرنے سے پابند کر لیا ہے گو مشورہ ماننے کی پابندی نہیں ہے۔ صرف کشمیر ہی
ایسی ریاست ہے جس نے خارجہ تعلقات کے متعلق کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے
اور یوں بھی اس کی سرحد تبت، روس اور افغانستان کی تین اجنبی مملکتوں سے
ملتی ہے مگر اس آزادی سے کشمیر کے کسی فائدہ اٹھانے کا پتہ نہیں چلتا شاید
اس کی وجہ یہ ہے کہ سکھوں سے فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے یہ علاقہ فی بردہ
سترہ بندگان خدا اور پانچ مربع میل کے حساب سے موجودہ حکمران خاندان
کے مورث اعلا کے ہاتھ (۷۰) ہزار روپوں میں فروخت کر دیا۔ اور اس کی
حیثیت انگریزوں کے سندی عطیے کی ہے کشمیر و جموں کا رقبہ کوئی پچاسی ہزار
مربع میل ہے اور کشمیر کا (۸۰۰۰۰) مربع میل۔ اور کشمیر کا وزیر خارجہ کوئی انگریز
ہی ہوا کرتا ہے۔

نیابتیں

(۲۷۵) نیابتوں سے مراد یہ ہے کہ کوئی سلطنت اپنے کسی سرکاری منشور یا
سند کے ذریعے اپنی رعایا کی ایک شراکت یا کمپنی بنائے اور وہ غیر ممالک میں
جا کر مقامی رعایا وغیرہ سے معاشی اور دیگر حقوق و مراعات حاصل کرے۔ تاریخ
بتاتی ہے کہ ایسی شراکتیں وسیع علاقوں پر واقعی حکومت کرتی رہی ہیں۔ اور
اس علاقے کا الحاق ان کی اصل مملکت کے ساتھ بڑی دیر سے ہوا۔ وہ اپنی

مملکت کی تو ماتحت رہیں مگر جنگ اور صلح کرتی رہیں، قانون سازی اور عدل گستری انجام دیتی رہیں اور قریب قریب وہ تمام فرائض خود ہی صوابدید پر ادا کرتی رہیں جو کسی مملکت پر عائد ہوتے ہیں۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستانیوں کو عرصے تک راست تعلق رہا ہے۔ برٹش نارتھ بورنیو کمپنی، برٹش ساؤتھ افریقہ کمپنی، وغیرہ بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔

ایسی جزوی خود مختار نیابتوں کو جزوی مقتدر مملکتوں سے الگ کرنا ضروری ہے۔

شورش بغاوت اور خانہ جنگی

۲۸۴۔ قانون بین الممالک کا تیسرا موضوع بحث بغاوت اور خانہ جنگی ہے۔ کسی ملک کی متصرف و مستقل حکومت کو ہٹانے کے لئے اس سے مقابلہ کرنا بغاوت کہلاتا ہے۔ بغاوت ابتدا میں شورش ہوتی ہے جس کا تعلق صرف قانون ملک سے ہے۔ شورشیوں میں جب اتنی طاقت آجائے کہ وہ کسی علاقے پر تصرف کر کے وہاں کسی باقاعدہ مہذب حکومت کے فرائض انجام دینے لگیں تو وہ باغی کہلاتے ہیں۔ اگر باغیوں میں اتنی قوت تو نہ ہو کہ اصل حکومت کی جگہ لے سکیں لیکن اس سے مستغنی ہو کر مستقل ہو جائیں اور اس کے حریف بن کر جنگ جاری رکھیں تو یہ خانہ جنگی کہلاتی ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ اصل حکومت کے کسی صدر کی وفات یا علاحدگی پر حکومت کے دو مدعی کھڑے ہوں یا کسی موجودہ حاکم کے خلاف شورش شروع ہو کر طاقتور ہو جائے۔

۲۸۵۔ جوں ہی کوئی شورش بغاوت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور باغیوں کی

حکومت قائم ہو جاتی ہے تو ناگزیر ان کے تعلقات آس پاس کے علاقوں سے ہونے لگتے ہیں۔ باغیوں کی حکومت کو مملکت تسلیم کر لینے سے بڑھ کر ان کی اصل حکومت کی کوئی اور توہین نہیں۔ اس لئے بغاوت کو بغاوت تسلیم کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ باغیوں کی فوجوں کو فوج سمجھا جاتا ہے، ڈاکوؤں کا جتھا نہیں؛ نہ ان کے جنگی جہازوں کے کام کو بحری ڈاکہ اور نہ مفتوحہ علاقے میں اُن کے فوجی حربانوں اور استحصال کو رہزنی اور غصب۔ ان کے بحری محاصرے اور ناکہ بندی کا احترام غیر جانبدار ممالک پر واجب ہے۔ غرض ان کو وہ سب حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو کسی جائز فریق جنگ مملکت کو۔ اور چونکہ اس طرح اصل حکومت غیر جانبداروں کے مقابل باغیوں کے افعال کی ذمہ داری سے بری ہو جاتی ہے اس لئے وہ بھی اس تسلیم بغاوت کو ناپسند نہیں کرتی۔

مُستامن

(۲۹) ایک مملکت کی رعایا جب امن اور اجازت لے کر دوسری مملکت میں جائے تو وہ مُستامن کہلاتی ہے جیسے سیاح، تاجر وغیرہ (سفیروں کا ذکر الگ ہوگا)۔

غیر ملک کے باشندوں پر مقامی حکومت کو جو عدالتی اقتدار اور اختیار سماعت حاصل ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ قانون ملک سے متعلق ہے لیکن اگر مستامن کی اصل حکومت اور اس کی مقامی حکومت میں جنگ چھڑ جائے تو مقامی حکومت، مستامن کی نظر بندی، اخراج وغیرہ کے متعلق جو کارروائیاں کرتی ہے ان کا تعلق قانون بین الممالک سے ہے۔ اسی طرح کسی مملکت کو اس کی رعایا سے جو غیر ملک میں گئی

ہوئی ہو تعلق خاطر ہوتا ہے اور اس کے بعض حقوق مثلاً مراعات خصوصی (کاپیچولیشن) کا تعلق قانون بین الممالک ہی سے ہے۔

یہاں ایک بات واضح کر دینی ہے کہ غیر ملکی مستامن سے جو برتاؤ مقامی حکومت کرتی ہے، اُسے قدیم سے خصوصی قواعد کا تابع رکھا گیا ہے اور مستامنوں سے عام قانون ملک متعلق نہیں ہوتا ہے۔ رومی اسے "یُس گنتیم" کہتے تھے اور ایک خصوصی عہدہ دار (پریٹر پریگرینیس) ان کی انصاف رسانی کے لئے مامور تھا۔ حضرت عمرؓ نے قوم وار عدالتیں مقرر کر دی تھیں مثلاً یہودی، عیسائی، مجوسی وغیرہ کی اور یہ مستامن اپنی ہم قوموں کی عدالتوں سے داد فریاد کرتے تھے۔ قدیم زمانے میں تجارتی جھگڑے بھی اسی سے متعلق تھے۔ اب زیادہ تر نکاح، نسب، وراثت، طلاق، حضانت سے ان کا تعلق ہے۔ حقیقت میں مقامی حکومت ہی کو مستامنوں پر اختیار سماعت حاصل ہوتا ہے لیکن اجنبی مستامنوں کے متعلق بین الممالک تلطف نے معاہدات کی بنیاد ڈالی ہے اور عام قانون ملک ان سے متعلق نہیں کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے قانون کو "بین الممالک خانگی یا خصوصی قانون" یا "تصادم قوانین" بھی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے تمام تعلقات جو خانگی امور سے متعلق ہیں، سرکاری نہیں، اور ساتھ ہی جن سے بین الممالک نتائج پیدا ہوتے ہیں، ایک مستقل قانون بن گیا ہے جس کو عام "سرکاری قانون بین الممالک" سے امتیاز کرنا چاہیے۔

مجلسِ اقوام

(۲۰۵) یہ بھی کچھ عرصے سے موضوعِ بحث بن گئی ہے۔ ناپولیون د بوناپارٹ کی تہلکہ ڈالنے والی جنگیں ختم ہوئیں تو کاسلری انگریزی وزیرِ خارجہ نے ایک انجمن وزرائے خارجہ قائم کی جس نے پانچ سات سال تک سالانہ جمع ہو کر خارجہ مسائل اور تعلقات پر غور اور مشورہ بھی کیا۔[1] اسی زمانہ میں زارِ روس شہنشاہِ آسٹریا اور شاہِ پروشیا (جرمنی) نے ایک تحالفِ مقدس (ہولی الائنس) کی بنیاد ڈالی کہ حلف گیرندہ بادشاہ اپنے داخلی انتظامات اور خارجی تعلقات میں عیسائی اخلاق کو ملحوظ رکھیں۔ یہ ایک بین الملوک حلف تھا جس سے ان کی حکومتوں کو کوئی تعلق نہ تھا۔ بعض دستوری مشکلوں سے برطانیا اس میں شریک نہ ہو سکا ورنہ اکثر یورپی بادشاہ اس میں شریک ہو گئے۔[2] یہ تحالف حق شناسی کے تحت یورپ میں دستوری انقلابوں کو روکنے اور موجودہ حکمران خاندانوں کی مدد کرنے اور عیسائیوں کو غیر عیسائیوں (مثلاً ترکوں) سے آزاد کرانے میں مسلح اتحادی حصہ لیتا رہا۔ اور اسی جوش اور زعم میں حلف گیروں نے جنوبی امریکا خاص کر میکسیکو کے معاملات میں مداخلت شروع کی۔ اس کا ردِ عمل[3] وہ مشہور مقولہ تھا جو ممالک متحدہ امریکا کے ایک صدر منرو کی جانب منسوب ہے چنانچہ اس نے ۲ دسمبر ۱۸۲۳ء کو امریکی پارلیمان سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ امریکی معاملات میں

---

[1] نپولیون ابرٹی۔ [2] اردپیڈیا ہم حصہ ۱ صفحہ ۷۴ تا ۷۷۔ [3] ایضاً حصہ ۱ صفحہ ۷۷۳

غیر امریکیوں کو دخل دینا نہیں چاہیئے اور نہ اپنے اصول حکومت امریکا میں رائج کرنے کی کوشش کی ورنہ ممالک متحدہ امریکا کی حکومت جیسے دونوں امریکاؤں میں ایک برتری اور اولیت حاصل ہے، اسے اپنے خلاف ایک خطرناک فعل تصور کرے گی ممالک متحدہ امریکا کی روز افزوں قوت اس یکطرفہ اعلان کا احترام کرنے پر دنیا کو مجبور کرتی رہی ہے۔ اس کے ردعمل نیز یورپ کے واقعات نے تحالف مقدس کا جلدی ہی خاتمہ کر دیا۔ پھر توازن قوت کی کوشش ہوتی رہی تاکہ یورپ میں امن قائم رہے۔ اس عرصے میں دستوریت کی ہر دلعزیزی بین الممالک کانفرنسوں کے ذریعے قانون سازی کی روز افزونی صحافت اور ذرائع حمل و نقل کی ترقی سے بین الاقوامی تعلقات اور باہمی احتیاج کا بڑھنا اور انسانیت کی خدمت کے جذبے کا پھیلنا۔ ان سب باتوں نے مل کر ایک دو سلطنتوں کی انجمن بنانے اور بین الممالک امن و آشتی کے لئے متحدہ کوشش پیدا کرنے کا راستہ صاف کر دیا۔ ۱۹۱۴ء کی بڑی جنگ چھڑی تو متعدد بلند خیال اور بلند مرتبہ لوگوں نے پھر ایک مرتبہ اس کا زور و شور سے اعادہ کیا اور اس کے قواعد بھی بنائے جاتے رہے۔ امریکا بھی جب جنگ میں شریک ہو گیا تو اس کے عالم صدر جمہوریہ (ولسن) نے اختتام جنگ پر اپنے مشہور چودہ نقاط شائع کیے جن کے مطابق صلح کی جانی چاہیئے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ مفتوحہ ممالک مال غنیمت نہ سمجھے جائیں، سلطنتوں کا قیام اور حدود قوموں کے لحاظ سے ہو، نیز ایک مجلس اقوام قائم ہو۔ چنانچہ ۱۴ فروری سنہ ۱۹۱۹ء کو اس کا دستور

ملہ اوپن ہائم جلد ۱ صفحہ ۱۳۔ ملہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا در "فورٹین پائنٹس"۔

منظور کیا گیا[1] اور صلح نامۂ ورسائی کے ساتھ نافذ بھی ہوا

۵۱۵ (۳) مجلس اقوام میں صرف خود مختار سلطنتیں رکن ہو سکتی ہیں[2]۔ برطانوی حکومت نے اپنی مصلحت سے اپنی بڑی قلمروؤں کو بشمول ہندوستان اس کا رکن بنا دیا۔

مجلس اقوام کی تنظیم یوں ہے:۔

(۱) مجلس عام (اسمبلی)

(۲) مجلس عاملہ (کونسل)

(۳) معتمدی انتظامی (سکریٹیٹ)

مجلس عام میں جملہ ارکان شریک ہوتے ہیں۔ ارکان گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں مثلاً امریکا حجاز اور ایکویڈور ابانیوں میں سے ہیں لیکن اس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ برازیل اور جاپان شروع سے شریک رہ کر خارج ہو گئے جرمنی بعد میں شریک ہو کر خارج ہو گیا۔ روس، ترکی، افغانستان، عراق وغیرہ بعد میں شریک ہوئے۔ مصر ایک تازہ امیدوار ہے، شام اور لبنان کی قریبی شرکت کے بھی امکانات ہیں۔ اور اس وقت حبشہ کو ملا کر (۵۹) ممالک اس میں شریک ہیں۔

مجلس عاملہ میں چار ممالک مستقل نشست رکھتی ہیں (انگلستان، فرانس، اٹلی، روس) ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ جاپان اور جرمنی بھی مستقل رکن تھے۔ امریکا کو بھی مستقل نشست پیش کی گئی تھی۔ ان کے علاوہ بارہ غیر مستقل ارکان ہیں جن کا مجلس عام تین سال کے لئے انتخاب کرتی ہے۔

عملۂ معتمدی جو جنیوا میں ہے، جملہ اقوام کے افراد سے بھرتی ہو سکتا ہے معتمدی میں

---

[1] اوپن ہائم جلد ۱ صفحہ ۳۱۵۔ [2] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۱۲۰ کوالہ ۲ میں شرائط شرکت دیکھئے۔ [3] اسٹیٹ مینس ایر بک ۱۹۳۵ء (زیر موقع)۔

(جو اجلاس ہائے مجلس عام و مجلس عاملہ کا انتظام کرتی ہے) حسب ذیل شعبے ہیں:-
(۱)۔ قانونی بشمول رجسٹری معاہدات بین الممالک۔

(۲) سیاسی۔

(۳) معاشی و مالی۔

(۴) نگرانی انتظامات (بندرگاہ دانشینس [یا ڈانزگ] سابق میں سار بھی اس کے تحت تھا) اقلیتوں سے سلوک کی نگہداشت بھی اس کے فرائض میں ہے۔

(۵) حمل و نقل۔

(۶) حفظان صحت۔

(۷) سماجی مسائل۔

(۸)۔ انتدابات۔

(۹)۔ ذہنی و علمی تعاون عالم۔

(۱۰)۔ تجدید اسلحہ۔

(۱۱) معلومات عامہ۔

۳۲ھ چونکہ مفتوحہ ممالک کو بطور مال غنیمت تقسیم کرنے کی امریکہ نے مخالفت کی تھی اور قومی حکومتیں قائم کرنا مقصود تھا، اس لئے مفتوحوں کی بعض سلطنتیں برخاست اور بعض نئی سلطنتیں مثلاً یوگوسلاویا، چکوسلواکیا، پولینڈ وغیرہ قائم کی گئیں ترکی کے غیر ترکی علاقوں (شام، عراق، فلسطین) اور جرمنی کے نوآبادیات کے متعلق طے ہوا کہ خود مختار ہونے کی مستحق ہیں لیکن ابھی خود مختاری کی صلاحیت ان میں نہیں ہے

عـہ ادین ہائم جـ۱ صـ ۳۴ تا ۳۵ -

اس لئے انہیں چند سلطنتوں کی نگرانی میں تربیت حاصل کرنی چاہیئے۔ قبرص اور مصر سے انگریزی مفاد وابستہ ہونے کے باعث ان سے بحث نہیں کی گئی۔ البتہ عراق اور فلسطین انگریزی نگرانی میں دے گئے تمام و لبنان فرانس کو ملے آرمینیا امریکا کو پیش کیا گیا اور اناطولیا کا اٹلی سے وعدہ تھا۔ لیکن ترکی کی جدید انگیز آزادی نیز اس کے استحکام سے اناطولیا اور آرمینیا کے مسائل خود بخود ختم ہوگئے چونکہ جنگ عظیم میں متحدین کو عربوں اور آرمینیوں سے مدد ملی تھی اور ان کو آزاد کرانے کے وعدے کئے گئے تھے شاید اسی لئے ان کو دیہاتوں کا انتداب قرار دیا گیا کہ تھوڑی سی تربیت کے بعد وہ خود مختاری اور مجلس اقوام کی شرکت کے مستحق ہیں چنانچہ مالی مداخلت اور عدالتی اور انتظامی خود اکتفائی اور قابل اعتماد نظام ثابت کرنے پر عراق کو آزاد تسلیم بھی کر لیا گیا اور انتداب ختم ہوگیا (۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء مطابق ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۱ھ)۔

وسطی افریقہ کے بعض جرمن نوآبادیات کی انتظامی قابلیت اور صلاحیت ایسی نہیں سمجھی گئی کہ وہ آزاد کئے جائیں۔ البتہ وہاں کے باشندوں کو مذہبی آزادی دی گئی اور یہ حکم دیا گیا کہ وہاں امن و اخلاق قائم رکھے جائیں لیکن نہ تو وہاں قلعے بنائے جائیں اور نہ وہاں کے باشندوں کو پولیس سے زیادہ کوئی فوجی تربیت دی جائے غلاموں اور ہتھیاروں کی خرید و فروخت نہ ہونے دی جائے اور حلیفوں کا ان مجلس اقوام کو مساوی تجارتی مراعات وہاں دی جائیں۔ چنانچہ کیمرون اور ٹوگولینڈ کے کچھ کچھ حصے فرانس کو اور کچھ انگریزوں کو دیے گئے۔ ٹانگانیکا انگریزوں کو اور روانڈا اور ارونڈی بلجیم کو۔ بعد [illegible]

دوم کا انتداب تھا۔

درجہ سوم کا انتداب جنوب مغربی افریقہ اور بحرالکاہل کے جرمن نو آبادیات کا تھا جو آبادی کی کمی، رقبے کے چھوٹے پن اور دیگر وجوہات سے علاحدہ ہونے کے قابل نہ تھے۔ طے ہوا کہ انتدابی حکومت ان کا اپنے علاقوں سے الحاق کر لے البتہ اصلی باشندوں کے ساتھ مذکورہ بالا احتیاطات ملحوظ رہیں۔ چنانچہ:-

۱۔ جنوبی مغربی افریقہ ہمسایہ انگریزی قلمرو جنوبی افریقہ کو،
۲۔ ساموا نیوزی لینڈ کی انگریزی قلمرو کو،
۳۔ ناورو برطانیہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو مشترکہ طور سے،
۴۔ خط استوا کے جنوب کے جزائر آسٹریلیا کی انگریزی قلمرو کو،
۵۔ ″ ″ شمال کے جزائر جاپان کو،

دیے گئے۔[1] انتدابی متولیوں سے سالانہ رپورٹ کا منگانا طے ہوا جو مجلس اقوام میں پیش کی جاتی ہے۔ لیکن زیر انتداب باشندوں کی مجلس اقوام میں کوئی شنوائی نہیں ہے کہ ان پہ کہیں ظلم تو نہیں ہو رہا ہے۔ انتداب کے بعد عراق، شام اور فلسطین کے ہنگامے اور قتل عام کے کئی واقعے پیش آ چکے ہیں خاص کر دمشق پر جنرل سرائے کی گولہ باری[2] کے زمانے میں جس پر پارلیمان میں ایک سوال کے جواب میں بروایت لنڈن ٹائمز وزیر اعظم مسٹر بالڈون نے کہا تھا "ہمارے رفیق فرانس کی اس حرکت پہ ہمیں چپ رہنا ہی مناسب ہوگا کیونکہ ہم سے بھی ایسی ہی حرکتیں ہوتی رہی ہیں۔" معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتدابات ان ملکوں کی

[1] اوپن ہائم جلد ۱ صفحہ ۲۰۶ تا ۲۰۹۔ [2] ٹائن بی۔ سروے آف انٹرنیشنل افیئرس سنہ ۱۹۲۵ جلد ۱ صفحہ ۴۳۴

شخصی حیثیت میں دئے گئے ہیں مجلس اقوام کے رکن ہونے کی حیثیت سے نہیں چنانچہ جاپان نے جب مجلس اقوام سے علاحدگی اختیار کی تو شمالی استوائی جزائر کی واپسی کے مطالبہ پر اس نے یہی جواب دے کر حوالگی اور واپسی سے انکار کیا۔

ف ۳۳۔ ذیلی مجالس میں جو مجلس اقوام سے متعلق مگر خود مختار کام کرتی ہیں، ہیگ کی بین الممالک عدالت اور جنیوا کی تنظیم محنت (لیبر آرگانزیشن) ہیں اوّل الذکر میں مختلف اقوام عالم کے ماہرین قانون کو جج بنایا جاتا ہے۔ اور اس عدالت میں صرف سلطنتوں کے باہمی جھگڑے پیش ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی معاہدے کی تعبیر، کسی خلاف ورزی قاعدۂ بین الممالک کے ہرجے کا تعین وغیرہ۔ تنظیم محنت میں جو ملک شریک ہو سکتے ہیں، ان کے لئے مجلس اقوام میں شریک ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کی کوشش سے دنیا کے مزدوروں کی حالت کچھ نہ کچھ بہتر ہو رہی ہے اس ادارے کے قیام کا مقصد غالباً بالشویت کا خوف تھا نہ کہ مزدوری پیشہ لوگوں سے کوئی خاص ہمدردی۔

بین الممالک شخصیت کا تسلیم کیا جانا

ف ۳۴۔ مغربی مولفوں کے مطابق قانون بین الممالک کے حقوق و واجبات سے متمتع ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کسی ملک کو مہذب مملکتوں کے سماج میں شریک کیا جائے اور اس کی بین الممالک شخصیت کو تسلیم کیا جائے۔

کبھی تو یہ صریح اعلان کے ذریعے ہوتا ہے جیسے ۱۸۵۶ء میں یوروپ کی بڑی سلطنتوں نے ترکی کے متعلق کیا۔ پھر بعد میں ایران، چین، اور جاپان وغیرہ

کے متعلق بھی عمل میں آیا۔

کبھی کسی معاہدے کے ضمن میں اس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض وقت شرائط کے تابع تسلیم کیا جاتا ہے مثلاً ۱۸۷۸ء میں بلغاریا، رومانیا، سربیا، اور جبل اسود کو معاہدہ برلین میں ترکی سے الگ خود مختار اس شرط سے تسلیم کیا گیا کہ وہ اقلیتوں کے متعلق روادار رہیں[۱]۔ یا یونان کو اس شرط سے کہ وہاں دستوری حکومت رہے[۲]۔

معناً تسلیم یوں ہوتی ہے کہ یا تو وہاں سفیر بھیجے جائیں یا اس ملک سے ایسے تعلقات یا معاہدات کئے جائیں جو صرف خود مختار ممالک سے کئے جا سکتے ہیں جیسے ۱۷۷۸ء میں فرانس نے باغی امریکیوں سے کیا تھا جب وہ برطانیہ سے آزاد ہونے کے لئے کشمکش کر رہے تھے[۳]۔

اب مجلس اقوام کی شرکت بھی ایک طریقہ ہو گئی ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ تسلیم ایک ہی مملکت کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب یا اکثر ممالک کریں مثلاً منچوکو کو اولاً صرف اٹلی نے تسلیم کیا۔ یا پوپ کی سلطنت واٹیکان کو صرف رومن کیتھولک عیسائی سلطنتیں مانتی ہیں۔ جدید ترکی نے تو اس کے نمائندوں کے لئے خانگی ملاقاتوں سے بڑھ کر کسی قسم کے القاب یا سفارتی مراعات ملحوظ رکھنے سے بھی انکار کر دیا ہے[۴]۔

تسلیم کرنے کا سوال نہ صرف ان ممالک کی حد تک پیش آتا ہے جو اب تک مہذب نہیں مانے جاتے تھے بلکہ اس وقت بھی جب مثلاً غیر آباد یا غیر مہذب ممالک میں مہذب نو آباد کار بس کر سلطنت کی بنا ڈالیں جیسا کہ امریکہ، آسٹریلیا اور افریقہ میں

---

[۱] اوپن ہائم ج ۱ صفحہ ۱۴۷۔ [۲] لارنس صفحہ ۱۲۲۔ [۳] ایضاً صفحہ ۸۴۔ [۴] اورینٹے مودیرنو جنوری ۱۹۳۵ء صفحہ ۸۔ [۵] لارنس صفحہ ۸۳۔

یا باغی یا بیرونی حملہ آور کسی موجودہ مہذب حکومت کی جگہ لے لیں۔ اس صورت میں نئی حکومت، سابقہ حکومت کے حقوق کے ساتھ اس کے اکثر واجبات مثلاً قرضوں معاہدات مراعات وغیرہ کی بھی بڑی حد تک جانشین ہوتی ہے[1] (الغنم مع الغرم) جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ قیصر ہند کی حکومت۔ (یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانشین ہے مغلیہ سلطنت کی نہیں)۔

قانون بین الممالک کے ماخذ اور مصادر

۳۵ھ۔ کسی قاعدے کے ماخذ سے مراد یا تو یہ ہوتا ہے کہ وہ قاعدہ قاعدہ بن کر اور قانونی حیثیت حاصل کر کے کہاں مل سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قانونی حیثیت حاصل کرنے اور پابندی عائد کرنے والا بننے سے پہلے اس کی تجویز اور اس کا خیال کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۶ھ۔ پہلے معنے میں قانون بین الممالک کا ماخذ اب تک ایک اور صرف ایک ہے یعنی بین الممالک رضامندی یہ خواہ طوعاً ہو یا کرہاً، صریح ہو یا معنوی۔ کرہاً رضامندی کی ایک مثال مقولۂ منزو کو ماننا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکم بھی کہ حجاز میں غیر مسلم نہ رہیں۔

۳۷ھ۔ دوسرے معنے ہی سے ہم یہاں بحث کریں گے اس کو عربی مؤلف "اصول" یعنی قانون کی "جڑیں" کہتے ہیں۔ اس معنے میں جو ماخذ ہیں ان سے بین الممالک پابندی خود بخود ضروری نہیں ہو جاتی۔

---

[1] لارنس ص ۹۱

۱۔ اکثر مہذب ممالک کے ہاں قدیم سے بین الممالک[1] تعلقات کے کسی نہ کسی جز کے لیے
قانون ملکی وضع ہوتا رہا ہے۔ یہ بڑا ماخذ ہے۔

۲۔ آراء۔ بعض محققین بین الممالک قانون پر جو لوگ کتابیں تالیف کرتے ہیں یا بین الممالک
قانون کے ماہروں کی جو انجمنیں ہیں، ان کا نہ صرف اجماع بلکہ انفرادی یا کثرتی
قیاس بھی ایک ماخذ ہے۔ اور یہ محققین یا مولف کی ذاتی وقعت کے لحاظ سے اس کی
رائے کی قدر و قیمت ہو سکے گی۔ اور رفتہ رفتہ کسی رائے پر اتفاق یا کسی اختلافی مسئلے کا
تصفیہ ہو سکے گا۔ خاص کر جب بالکل نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں تو گذشتہ یا موجودہ
ماہروں کی رائیں نکلتی اور دیکھی جاتی ہیں مثلاً امریکا کی دریافت پر اور ہوائی
جہاز کی ایجاد پر بہت سے ایسے مسئلے پیدا ہو گئے جن کے متعلق موجودہ قانون بین الممالک
خاموش تھا اور حل کے لئے کوئی مدد نہیں دیتا تھا۔ یورپی قانون میں جنتیلس، گروشیس،
آماری، واتل، وہیٹن اور ویسٹ لیک، ہال، لنڈ، اوپن ہائم، لارنس، فوشی، نیس،
بیبرین یاکی، بلونچلی، فون لسٹ وغیرہ زمانہ حال میں مشہور مولف گزرے ہیں۔
فرانس، انگلستان، امریکا وغیرہ میں قانون بین الممالک کی علمی انجمنیں بھی ہیں جن
میں دنیا بھر کے علما حصہ لیتے ہیں۔ اور ان کے مباحث شائع کئے جاتے ہیں۔

۳۔ معاہدات۔ ان کی بہت سی صورتیں ہیں۔ کبھی ان کا منشا ہی قانون سازی ہوتا ہے
یا طرز عمل اور رواج کو مدون کرنا جیسا کہ ہیگ میں منعقد شدہ سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۷ء
کی دونوں کانفرنسوں میں ہوا۔[2] اس کی صورت اکثر یوں ہوتی ہے کہ چند ممالک کانفرنس
کر کے کچھ طے کرتے ہیں اور اطلاع پر دوسرے اس کو اعلان یا خاموشی سے منظور

---

[1] لارنس صفحہ ۹۹۔ (پروفیسر پیرس ہیلس نے اس پر ایک مستقل کتاب ۱۹۰۹ء میں شائع کی ہے)۔

کر لیتے ہیں معاہدات سے بعض وقت قانون سازی یا تدوین رواج مقصود نہیں ہوتا
بلکہ کسی بین الممالک جھگڑے کا تسویہ ہوتا ہے اور اس فیصلے سے جو نظیر قائم ہوتی ہے
وہ بھی ایک ماخذ قانون بن جاتی ہے ۔

۴۔ کسی تحکیم یا ثالثی کے فیصلے، کسی عدالت غنائم بحری کے فیصلے یا کسی بین الممالک قانونی عدالت (مثلاً ہیگ کی کورٹ آف انٹرنیشنل جسٹس) کے فیصلے یا حالیہ زمانہ میں خود مجلس اقوام کے فیصلے، مشورے، طرز عمل وغیرہ بھی مفید مواد مہیا کر سکتے ہیں۔

۵۔ معاہدات کے علاوہ دیگر سرکاری کاغذوں اور مراسلوں اور خاص کر سفارتی ماجراؤں سے مدد مل سکتی ہے ۔

۶۔ آخر میں لیکن کافی اہم وہ سرکاری ہدایتیں ہیں جو سفیروں، سپہ سالاروں، امیرالبحروں، امیرالہواؤں کو دی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں خود عہد نبوی اور خلفائے راشدہ کے زمانے کی ایسی متعدد دلچسپ دستاویزیں تاریخ نے محفوظ کی ہیں۔ (دیکھئے اوپر فقرہ ۱) امریکا اور جرمنی کی حکومتوں نے بھی ایسے قواعد مرتب کر کے شائع کئے ہیں ۔

قانون بین الممالک کی وسعت اور حیثیت

۳۸ف۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قانون بین الممالک کے موضوع کیا کیا ہیں ۔ ان موضوعوں کے جن ذاتیات یا عرضیات سے ہمیں بحث ہے وہ تین بڑے حصوں میں منحصر ہیں :-

۱۔ مسالمانہ یا امن و صلح کے تعلقات ۔
۲۔ مخاصمانہ تعلقات اور جنگ ۔

۴۔ چند ممالک میں جنگ کے وقت دوسروں کی غیر جانبداری۔

مسالمانہ تعلقات سے جو حقوق و فرائض متعلق ہیں ان کو عادی کہا جاتا ہے اور ان کی خلاف ورزی کم ہوتی ہے اور وہ زیادہ معیّن ہیں۔ مخاصمانہ تعلقات کے حقوق و فرائض غیر عادی ہیں۔ جتنا زیادہ اس میں مطحیّت پیدا کرنے کی اور سترماتہراہی منظوری لینے کی کوشش کی جائے گی، اتنا ہی اس پر وقت پر کم عمل ہوتا ہے۔

غیر جانبدارانہ حقوق و فرائض بین بین ہیں۔

علم قانون میں قانون بین الممالک کی حیثیت معلوم کرنے کے لئے میں نے جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے طالب علم کو شاید سہولت اور آسانی ہو۔

(ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

- فریقین مقدمہ مملکت ہوں
  - ہر دو خود مختار
  - ایک خود مختار اور ایک جزؤ مختار
    - متولّی اور ماتحت ہیں
    - جزؤ مختار اور غیر متولّی مملکت ہیں
  - دونوں جزؤ مختار

- فریقین مقدمہ خانگی رعایا ہوں
  - ہر دو رعیت
  - ایک رعیت اور ایک اجنبی مستامن
  - ہر دو اجنبی مستامن

- ایک فریق مقدمہ مملکت اور دوسرا فرد رعیت ہو
  - حکومت اور اسکی رعیت
    - ایک ہی ملک کے
    - الگ الگ ملکوں کے
      - رعیت جب اپنے ملک میں ہو
      - جبکہ رعیت غیر ملک میں مسافر اور مستامن ہو
  - حکومت اور اجنبی مستامن

مقاصد

سلم یا امن و صلح

یٰایّھا النّاس ادخلوا فی السّلم کافّۃ
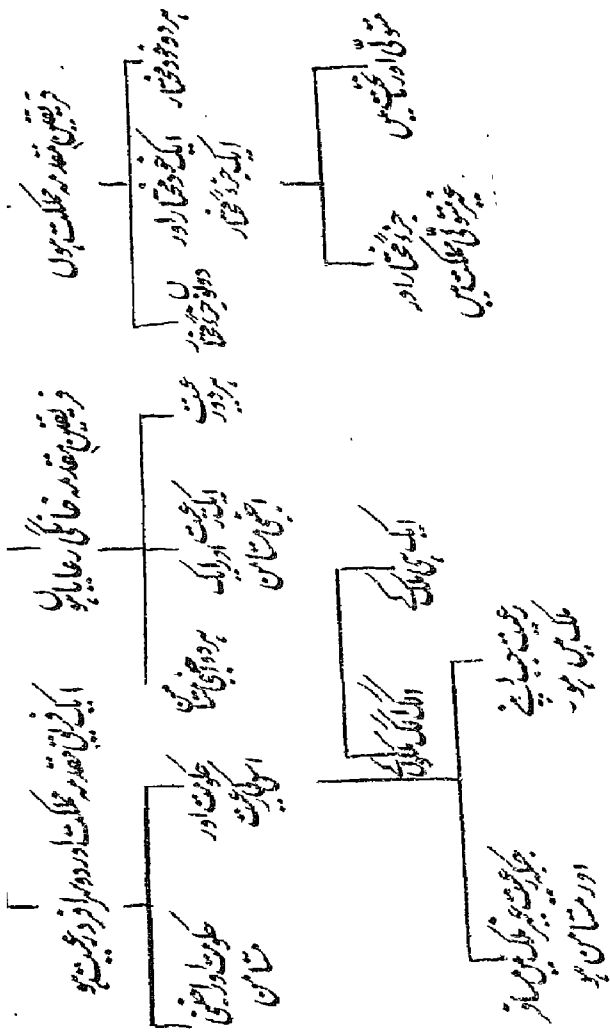
انسانو۔ تم سب امن و سلامتی سے رہو۔

اسلامی حکومت کا مطمحِ قدیم سے امن و سلم ہے اور جنگ کو ایک ناگزیر لیکن ہنگامی وقتی برائی کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ سلطنتوں کے بقول لارنس باہمی مسالمانہ تعلقات کے پانچ بڑے حصے کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ خود مختاری سے متعلق حقوق و فرائض

۲۔ جائداد ״ ״

۳۔ عدالتی اختیار سماعت ״ ״

۴۔ بین الممالک سماج میں مساوات ״

۵۔ سفارتی تعلقات ״ ״

خودمختاری

۵۸۔ کسی سلطنت کی خودمختاری یا استقلال سے مراد یہ ہے کہ اس کے داخلی یا خارجی معاملات کی سرانجام دہی میں کسی اور سلطنت کا دخل اور قابو نہ ہو۔[1] "جیو اور جینے دو" جس طرح افراد انسانی کے باہمی تعلقات کا مسلمہ اصول ہے اسی طرح ہر سیاسی وحدت کو اپنا علاحدہ وجود باقی رکھنے اور اپنے ذاتی معاملات میں خودمختارانہ طور سے اقتدار اعلا رکھنے اور برتنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ صرف دوسروں کے مماثل حقوق کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے

قدیم مذاہب قومی ہوتے تھے اس وقت سلطنتیں بھی مکمل خودمختار ہوتی تھیں۔ جب سے مذہبی رہنماؤں کا مقصد یہ ہوا کہ کسی قوم یا ملک نہیں بلکہ دنیا کے ہر حصے کی ہدایت اور فلاح ہو اور ایسے مذہب پھیلے بھی تو پھر عالمگیر حکومت کا تصور بھی ناگزیر پیدا ہو گیا، جو یونانی اور رومی عالمگیری سے اس معنے میں جدا تھا کہ ان کے ہاں مفتوحہ اقوام اور فاتح قوم میں مساوات نہیں ہو سکتی تھی۔ مذہب نے جملہ ایمان والوں کو مساوی قرار دے دیا۔ لیکن مذہبی لوگوں کے بگڑنے یا برے لوگوں کے مذہبی رہنمائی کی باگ ڈور حاصل کرنے سے جب مذہبی نظام

---

[1] لارنس ص ۱۱۵

مفید کی جگہ مضر ثابت ہونے لگا تو انفرادیت پسند انسان نے پھر ایک پلٹا کھایا۔ سنہ ۱۶۴۸ء کے معاہدہ ویسٹ فالیا نے مرکزیت مسیحیت و عقل کے اس نتیجے پر مہر ثبت کر دی اور مسیحی دنیا میں بھی مملکتوں کی مکمل خود مختاری تسلیم کی جانے لگی[1]
فی الحال غیر محدود خود مختاری کا کہیں وجود نہیں۔ صرف اضافی آزادیٔ عمل حاصل ہوتی ہے چنانچہ خود مختاری کے حق میں جہاں اپنی بقا کی مدافعت کرنی شامل ہے، وہیں دوسروں کی خود مختاری میں مداخلت نہ کرنے کا فریضہ بھی عائد ہوتا اور اسی حد تک آزادیٔ عمل کو محدود کرتا ہے۔

اس قدرتی تحدید کے علاوہ کسی مملکت کی آزادیٔ عمل پر بعض اور بھی پابندیاں عاید ہوتی ہیں مثلاً :-

۱۔ جب کوئی ملک اپنی قوت اور صلاحیت کی کمی کے باعث کسی قوی اور زبردست مملکت کے اثر میں آجاتا ہے اور جزوًا اپنے اقتدار اعلیٰ سے محروم ہو جاتا ہے مثلاً سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدے کے تحت حیدرآباد اس وقت تک خارجہ تعلقات پیدا نہیں کر سکتا جب تک انگریزی حکومت کو اطلاع دے کر مشورے میں شریک نہ رکھے۔ ایسی مختلف قسم کی پابندیاں افغانستان، عراق و مصر وغیرہ پر بھی رہی ہیں۔

۲۔ دوسرے جب خاص کر کسی جنگ میں شکست کے باعث مفتوح کو بہت سی شرطیں ماننی پڑتی ہیں جن سے اس کی خود مختاری اور آزادیٔ عمل

---

[1] لارنس ص ۱۱۶

کہ حَکَم کا فیصلہ وہ تسلیم اور نافذ کریں گے۔ چنانچہ حال میں افغانستان اور ایران میں سرحد کے متعلق جو جھگڑا ہوا تھا اس میں ترکی حکومت کو پنچ اور حَکَم بنایا گیا تھا اور اس کا فیصلہ فریقین نے مان لیا۔[۱] اسی طرح خلیج دیلاگوا کی ملکیت کے متعلق انگلستان اور پرتگال کا جھگڑا فرانس کے صدر جمہوریہ مارشل مکموہن نے بطور حَکَم ۱۸۷۵ء میں پرتگال کے حق میں طے کیا تھا۔[۲] حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا حقِ خلافت کے متعلق حَکَم مقرر کرنا[۳] ایک اہم تاریخی مثال ہے جس میں دو حَکَم مقرر ہوئے تھے چونکہ ان کا فیصلہ متفقہ نہ تھا اسلئے حضرت علیؓ نے اپنے نامزد حَکَم کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

مداخلت تین قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی تو کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں کسی تبدیلی مثلاً خانہ جنگی یا دستوری تبدیلی کو روکنے کے لئے ہوتی ہے اور کبھی خارجہ معاملات میں مثلاً کسی تیسری حکومت سے کئے ہوئے معاہدے کے نتائج سے گھبرا کر اس کو منسوخ کرانے کے لئے چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جرمنی اور آسٹریا نے چنگی کی حد تک باہم اتحاد کا معاہدہ کیا تھا چونکہ آسٹریا کے اس طرح رفتہ رفتہ جرمنی میں ضم ہو جانے کا خدشہ تھا، اس لئے فرانس کی مداخلت کے باعث یہ معاہدہ منسوخ کر دیا گیا۔ کبھی مداخلت انتقام کے لئے ہوتی ہے جس میں جنگ تو نہیں چھڑتی لیکن دھمکایا اور دباؤ ڈالا جاتا ہے اس کا تعلق اصل میں مخاصمانہ تعلقات سے ہے جن کا حصہ سوم میں ذکر ہوگا۔

۱؎ سالنامۂ کابل سنہ ۱۳۱۴ شمسی ص ۶۳-۶۴ ۲؎ ۱۹ مع نقشۂ منسلکہ ص ۳ ۲؎ آل انٹرنیشنل لا طبع ہفتم ص ۳۴ ۳؎ ان کے تقرر اور اختیارات کی دستاویز کا متن تاریخ طبری ص ۳۳۳۶ تا ۳۳۴۸ اور تاریخ دینوری ص ۱۹۶ تا ۱۹۹ میں ہے۔

۴۳ ۔ غیروں کے معاملات میں مداخلت سے ہمیشہ جھگڑے کا جوکھم لگا رہتا ہے اس لئے اس کو اختیار کرنے سے پہلے سلطنتیں بہت سوچ بچار لیتی ہیں۔ بہت سی صورتوں میں انھیں بین الممالک مخالفت اور فضیحت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ صرف چند صورتوں میں مداخلت کو قانون بین الممالک درست قرار دیتا ہے:۔

ا۔ حفاظت ذاتی کے لئے بشرطیکہ خطرہ یقینی ہوگیا ہو اور نقصان اتنا ہو کہ جنگ جائز ہو سکے اور بغیر مداخلت اور جبر یا دباؤ کے وہ ٹل نہ سکتا ہو۔ مثلاً گزشتہ صدی کے وسط میں میکسیکو کی بد انتظامی سے انگلستان، فرانس اور اسپین کو مالی نقصان پہنچ رہا تھا مقامی حکومت سے بے سود احتجاج کرنے کے بعد تینوں متفرق مملکتوں نے ۱۸۶۱ء میں میکسیکو میں فوج اتاری اور مطالبات منانے کی کوشش کی تھی [بعد میں فرانس کی بدنیتی[۱] دیکھ کر دونوں شرکائے کار نے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور فرانس نے اپنے ایک پٹھو کو وہاں کا شہنشاہ بنا دیا۔ آخر ممالک متحدہ امریکا کی دھمکی پر فرانسیسی فوج بھی واپس چلی گئی جس کے بعد غریب شہنشاہ میکسیملین کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا] [۲]

یورپ میں توازن قوت کے باقی رکھنے کے لئے بھی کسی مملکت کی قوت بہت بڑھنے لگتی تو مداخلت کی جاتی رہی وہ بھی اسی اصول کے تحت تھی کہ علاج سے احتیاط بہتر ہے۔

---

[۱] لارنس ص ۱۲۴

[۲] لارنس ص ۱۲۴

۲۔ معاہدات کے باعث۔ چنانچہ ایک جدید مثال یہ ہے کہ ۱۸۶۳ء
میں انگلستان، فرانس اور روس نے یونان کو ترکی سے آزاد کر کے خود مختار بنایا
البتہ شرط یہ لگائی کہ وہاں دستوری حکومت قائم رہے۔ ۱۹۱۵ء میں جنگ عظیم
کے موقع پر شاہ یونان کے جرمن نواز رجحانات دیکھ کر، دستور شکنی اور استبدادی
حکومت کے قیام کے الزام پر انگلستان، فرانس اور روس نے مداخلت
کی کہ بادشاہ تخت سے دستبردار ہو، فوج کے تیار رہنے کا حکم منسوخ کیا جائے
اور نئے انتخابات عمل میں لائے جائیں۔[1]

۳۔ انسانیت کے نام پر بھی مداخلتیں ہوتی رہی ہیں اور اکثر کوئی اور مطلب
پورا کرنے کے لیے اس کا بہانہ کیا جاتا رہا ہے۔ خاص کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کے لیے
اس کے تعمیری و اداراتی انتظام اور غیر مسلم رعایا پر ہیبتناک ظلم کی بنا پر بار بار یورپ کی بڑی
سلطنتیں مداخلت کرتی رہی ہیں۔ کوئی خدا پرست مملکت اگر مذہب کشی پر اشتراکیہ
روس میں مداخلت کرتی یا کوئی یہودی یا یہود نواز مملکت نازی جرمنی میں یہود آزاری پر مداخلت
کرتی تو اس کا عذر معقول سمجھا جاتا۔ کسی ملک میں انقلاب کو روکنے کے لیے یا
خانہ جنگی کے کسی فریق کی درخواست پر مداخلت کرنا اب عرصے سے یورپ
میں نامناسب سمجھا جا رہا ہے۔ خفیہ امداد کا تعلق قانون بین الممالک سے نہیں
ہے جو ظاہری امور پر حکم لگاتا ہے۔

۴۔ مرکب وجوہات مداخلت کے کئی موقعے پیش آئے ہیں۔

---

[1] لارنس ص ۱۴۲ تا ۴۳

۵ - بہانے بھی پیش کئے جاتے ہیں جیسے اٹلی نے طرابلس اور حال میں حبشہ پر قبضہ کرنے کے لئے کئے۔ ان موقعوں پر خود اپنے کارندوں کے ہاتھوں زیر نظر علاقے میں اپنے نقصان کا انتظام بھی کرایا جاتا ہے۔

جائداد

۴۴۔ افرادِ رعایا کی طرح خود مملکت بھی جائداد کی مالک ہو سکتی اور ہمیشہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر مملکت کے قبضے میں علاوہ جائداد غیر منقولہ کے کافی جائداد منقولہ بھی ہوتی ہے، جیسے ہتھیار، حمل و نقل کے ذرائع، خزانے، دستاویزیں وغیرہ۔ غیر منقولہ جائداد میں بعض چیزیں مصنوعی ہوتی ہیں، جیسے قلعے، تالاب، مکان وغیرہ۔ لیکن قانون بین الممالک کے اغراض کے لئے قدرتی غیر منقولہ جائداد یا ان کے متعلق کسی حق آسائش کا حصول اور حفاظت ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

یوں تو کسی ملک کی کچھ جائداد خالص خانگی ہوگی اور کچھ خالص سرکاری۔ لیکن ہر حکومت اپنی رعایا کی محافظ ہوتی ہے اس لئے خانگی جائداد بھی اس معنے میں سرکاری ہی ہے کہ اگر کوئی غیر مملکت اس پر قبضے کی کوشش کرے تو متضرر کی حکومت ہمیشہ آڑے آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خانگی جائداد کی ملکیت تو افرادِ رعایا کو حاصل رہتی ہے لیکن اقتدارِ اعلا حکومت ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

۴۵۔ یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ کسی مملکت کے لئے اراضی کا ہونا ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ جوں جوں قواے فطرت پر عقلِ انسانی کو قابو حاصل ہوتا جاتا ہے، اس میں نئے نئے سوال پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ ابتداءً صرف زمین اور اس کے اوپر اور اندر کی چیزوں کا لحاظ ہوتا ہوگا، ندیوں اور جھیلوں سے استفادہ اپنے آپ سے

مخصوص کرلینا بعد کی چیز ہوگی۔ کھلے سمندر کی اہمیت گزشتہ صدی کے دخانی اور کلوں سے چلنے والے جہازوں نے بڑھائی تو ہوا پر اسی صدی میں طیاروں اور لاسلکی کے امواج کے گزرنے کے باعث توجہ ہوئی ہے۔ اور وہ رومی مقولہ کہ "کسی زمین کے مالک کو نہ صرف اس پر بلکہ اس کے نیچے اور اوپر تحت الثرا سے ثریا تک ملکیت اور حق استفادہ حاصل ہوتا ہے"[۱] ـــــ صرف لفظی نہیں بلکہ اب ایک واقعی اہمیت پیدا کر چکا ہے۔

کسی مملکتی سرزمین کے اندر کی خشکی اور تری، اراضی، پہاڑ، معدنیات، ندی، جھیل، پٹرول وغیرہ کے متعلق تو کوئی پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی لیکن اگر دو مملکتوں کی سرحد پر کوئی ندی یا جھیل ہو جیسے کرشنا اور گوداوری حیدرآباد و برطانوی ہند میں ہیں یا دریائے نیاگرا اور جھیل اونٹاریو کاناڈا اور ممالک متحدہ امریکا میں ہیں تو بجز اس کے کہ سرحد کے متعلق فریقین میں کوئی اور معاہداتی یا رواجی فیصلہ ہو چکا ہو، ایسے پانی کے وسط تک سرحد سمجھی جاتی ہے۔[۲] اور اس بیچ سے گزرنے والے ذہنی خط سرحد کے ایک طرف جو جزیرے ہوں وہ ایک مملکت کے اور دوسری طرف کے دوسری مملکت کے سمجھے جاتے ہیں۔ اور اس پانی میں جہاز چلانے کا حق دونوں طرف کے ملکوں کو برابر حاصل رہتا ہے لیکن اگر کوئی ندی سرحد پر تو نہیں بلکہ اندرون ملک بہتی ہے البتہ اس کا منبع کسی ملک میں ہے اور دہانہ کسی ملک میں، تو اس کے متعلق بین الممالک رواج پہلے تو یہ تھا کہ ہر ملک اپنے مقبوضہ

۱۰۶۷

[۱] اوپن ہائم جلد ۱ صفحہ ۴۱۸ ـ [۲] لارنس صفحہ ۱۳۷

حصے پر پورا اقتدار رکھتا ہے[1] اور غیروں کو گزرنے سے روک سکتا ہے اور اپنے حصے میں بند اور تالاب بنا کر نیچے کے ملک کو پانی سے محروم کر سکتا ہے لیکن جدید رجحان، معاہدات وغیرہ کی بنا پر یہ ہو چلا ہے کہ ان تمام ممالک کو جن کے علاقوں میں کوئی ندی گزرتی اور سمندر میں جا ملتی ہو حالت امن میں بے روک ٹوک گزرنے کا مساوی حق ہے۔ روشنی اور دیگر ضرورتوں کے لئے البتہ ضروری ٹیکس وصول کئے جا سکتے ہیں۔ اور تالابوں کے متعلق متناسب حق ملنے چاہئیں۔

(۱۲) جب سے توپوں کا رواج ہوا ہے ساحل کے قریب کے سمندر کی اہمیت بھی جنگی اغراض اور مدافعت کے لئے بڑھ گئی ہے جس زمانہ میں انتہائی زد تین میل کی تھی، ہر بحری ممالک کی ساحل سے تین میل تک سمندر پر ملکیت تسلیم کی گئی تھی[2] جہاں وہ اپنی غیر جانبداری کے زمانے میں فریقین جنگ کو دست درازی سے روک سکتا ہے، غیر ملک کے لوگوں کو مچھلی کے شکار سے روک سکتا ہے اور ہر طرح اپنا اقتدار جتا سکتا ہے۔ اسی کو بحری فرسخ "اور تحت علاقہ سمندر" کہتے ہیں۔ اس سے آگے کھلے سمندر کو ملک خدا سمجھا جاتا ہے جس میں تمام ممالک کو بے خطر استفادے کے متعلق مساوی آزادی تسلیم کی جاتی ہے۔ گو کسی زمانے میں بحری قوتیں کھلے سمندر پر بھی ملکیت کی مدعی تھیں مثلاً ریاست ہائے وینس بحر ایڈریاٹک پر اور سلطنت ترکی بحر اسود پر مکمل اقتدار کی مدعی رہ چکی ہیں۔ کئی ممالک کے زیر اقتدار سمندر میں تین میل کے اب ناکافی ہونے کے باعث اضافے کی کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن مجموعی

---

[1] لارنس ص ۱۳۷ ۔ [2] لارنس ص ۱۳۸ ۔

حفظان صحت اور جنگی کے سلسلے میں نگرانی کے۔ دیگر امور میں بحری فرسخ کو بڑھانے پر اکثر ممالک راضی نہیں ہیں۔ البتہ ساحل کا شمار بجائے سخت زمین کے اس مقام سے ہوتا ہے جہاں ساحل کے قریب کے جزیرے ختم ہوتے ہوں اگرچہ وہ جزیرے آباد نہ ہوں یا نہ ہو سکتے ہوں۔

ظاہر ہے کہ کوئی خلیج جو چھ میل یا اس سے کم چوڑا ہو اور اس کے دونوں کنارے دو الگ ملکوں میں ہوں تو وہ کھلا سمندر نہیں رہے گا بلکہ ندیوں کی طرح خلیج کے بیچوں بیچ سرحد ہوگی۔

ایک عام قاعدہ ہے کہ پانی خشکی کا تابع ہے خشکی پانی کی نہیں۔[1] کسی خشکی پر قابض ملک اس سے متصل ندی یا جھیل کی ملکیت کا دعوی کر سکے گا لیکن کسی جھیل یا ندی کا قابض اس کی دوسری طرف کی خشکی کا مالک خود بخود نہیں ہو جاتا۔ البتہ جمہور و ضرورت کے لئے بین الممالک اہمیت رکھنے والے اندرون علاقہ قدرتی یا مصنوعی آبی شاہراہوں کے متعلق عموماً معاہدات ہوتے ہیں جیسے نہر سویز، آبنائے باسفورس، دردانیل، نہر کیل، نہر پاناما وغیرہ۔

مثلاً ۱۹۱۹ء میں[2] جو معاہدہ ہوا تھا انگلستان، فرانس، اٹلی وغیرہ سلطنتوں کا وہ صرف حالت امن کے متعلق ہے اور ہوا پر اس کے نیچے کے ملک کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ہر ملک کے طیاروں کے بے ضرر گزرنے کی اجازت دیتا ہے۔ غیر ممالک کے جنگی اور دیگر سرکاری جہاز اس سے مستثنیٰ ہیں۔

؎۱ لارنس صفحہ ۱۳۸ ؎۲ اوپن ہائم جلد ۱ صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۳

اسی طرح غیر ملک میں اجرت پر حمل و نقل کر کے تجارتی نفع کمانے کی اجازت نہیں۔ خانگی سفر میں بھی راستے، نگرانی وغیرہ کے متعلق کسی ملک کے بنائے ہوئے قواعد کا لحاظ رکھنا غیر ملکی طیاروں کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

۱۹۲۷ء میں لوزان میں انجمن قانون بین الممالک کے بین الاقوامی جلسے نے یہ سفارش کی ہے کہ لاسلکی خبر رسانی کے سلسلے میں غیر ملک کے بے ضرر پیاموں کا کسی ملک کی فضا میں سے گزر بے روک ٹوک ہونے دینا چاہئے لیکن خطرناک پرچار کے جس طرح مطبوعہ لٹریچر کو کوئی ملک داخل ہونے سے روک سکتا ہے اس طرح لاسلکی پر بول بھیجے ہوئے دعایے کو بھی ہر ملک روک سکتا ہے چنانچہ موسکو کی اشتراکی تقریریں ہندوستان میں سنائی نہ دینے کے لئے کہتے ہیں کہ حکومت ہند برقی ردِ عمل کی تدبیریں اختیار کرتی ہے۔

نئے علاقے کا حصول

ف ۴۸ کسی نئے علاقے کو حاصل کرنے کے مختلف ذریعے ہیں۔

ا۔ پہلے قبضہ ہے۔ کوئی ملک نو دریافت ہو یا غیر آباد یا غیر مہذب اقوام کے قبضے میں، اس پر جو مملکت پہلے قبضہ کرے وہ مالک ہو جاتی ہے۔ امریکا، آسٹریلیا، وسطی اور جنوبی افریقا کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوا تھا محض دریافت کافی نہیں، کسی سرکاری کارروائی کے ذریعے اس پر قبضہ اور الحاق ضروری ہے

ف۵ ۔ اوپن ہائم جلد ۱ ص ۳۶۹ حوالہ ۲

حالیہ زلزلے کے موقع پر جاپان کے کئی جزیرے غرقاب ہو گئے اور کئی نئے بن گئے۔ لیکن ساحل سے قربت کے باعث وہ خود بخود جاپان ہی کی ملک سمجھے جا سکتے ہیں۔

یہ سوال بڑا پیچیدہ ہے کہ ایک مقام پر قبضہ کرنے سے آس پاس کے کتنے علاقے پر خود بخود ملکیت قائم ہو جاتی ہے۔ کسی چھوٹے جزیرے یا بہت سے چھوٹے جزیروں کے مجمع الجزائر میں کسی ایک جگہ کا قبضہ کافی ہے۔ لیکن امریکا اور آسٹریلیا جیسے براعظموں میں ظاہر ہے کہ ایک گاؤں پر قبضہ پورے ملک کا حاکم نہیں بنا دیتا۔ عموماً قابض فوج کی قوت، اور اختلاف کی صورت میں متخاصمین کی طاقت فیصلہ کرتی اور معاہدے ہوتے ہیں۔

قطب شمالی پر سمندر ہے لیکن قطب جنوبی پر خشکی ہے اور لارنس کا خیال ہے کہ چونکہ الحاق کے لیے بسنا ضروری ہے اس لیے براعظم قطب جنوبی کے ناقابل آبادی علاقے پر جہاں ایک دن کم چھ مہینے مسلسل رات اور ایک دن کم چھ مہینے مسلسل دن ہوتا ہے، معاشی استفادے کے لیے کوئی ملک بغیر آباد ہوئے قبضہ کرے تو اس کا دعوا قابل قبول نہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ ملکیت کے حصول کا یہ ہے کہ قدرتی یا مصنوعی اسباب سے کسی ملک میں اضافہ ہو جائے۔ یہ صرف آب برآمد زمین سے متعلق ہے۔ سمندر یا ندی میں نئے جزیرے وقتاً فوقتاً بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں تو پچھواڑی کھاڑی کا ایک محلہ سمندر کو پاٹ کر نکالا گیا ہے۔ اگر سرحدی ندی محسوس ہوئے بغیر آہستہ آہستہ خفیف مقدار میں ہٹتی جائے تو

عموماً مفاد دار ملک راضی بتقدیر رہتے ہیں لیکن اگر کسی زلزلے یا طغیانی میں کوئی ندی یک بیک راستہ بدل دے تو لارنس کا بیان ہے کہ سرحد نہیں بدلتی بلکہ سابقہ گزرگاہ دریا کا وسط یا جہاں بھی سرحد رہی ہو، سرحد رہتا ہے۔

۳۔ تیسرا طریقہ سپردگی ہے جس کی لارنس نے تین قسمیں بیان کی ہیں: بیع، ہبہ اور تبادلہ۔ گو ایک اور قسم وراثت کا اس میں اضافہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔ حضرت عمرؒ ابن عبدالعزیز نے شہر ملطیہ کو بیزنطینیوں سے خرید لیا تھا[1]۔ روس نے ۱۸۶۷ء میں اپنے امریکی مقبوضات کو بنا کر متحدہ امریکا کے ہاتھ (۷۲) لاکھ ڈالر میں فروخت کر دیا۔ راجہ گلاب سنگھ نے کشمیر ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ میں انگریزوں سے خریدا تھا۔ ہبہ شاذ ہی خوشی سے ہوتا ہے۔ نزاعی زمین بعض وقت جہیز میں دے کر مجبوری کو چھپایا جاتا ہے۔ اضلاع مفوضہ حیدرآباد نے فرانسیسی کمپنی کو انعام میں دے تھے۔ انگریزی کمپنی نے جو حیدرآباد کی حلیف تھی فرانس سے وہ علاقے چھین لئے اور پھر ان کے متعلق اپنے نام انعام کا پروانہ حاصل کر لیا۔ تبادلہ اراضی کی بکثرت مثالیں قدیم تاریخ میں ملتی ہیں۔ ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ کے مشہور معاہدے

۱۔ عیون المعارف و فنون اخبار اللطائف مولفہ محمد بن سلامہ بن جعفر ورق ۱۷۷ (مخطوطہ توپ قپو سرائے، استانبول)

کی دفعہ ۶ کی رو سے بھی سرحد کی درستی کے لئے حیدرآباد اور برطانوی ہند میں بعض
علاقوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں ریاستہائے نے روس کو بسر ادائیگی سے کرو ر چہ
حاصل کیا تھا۔[۵] وراثت میں ملنے کی صورت زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ دو ملکوں
کا ولی عہد ایک ہی شخص ہو جائے۔ اس کی بعض مثالیں اوپر نقدام کے سلسلے
میں ص ۲۲ میں دی جا چکی ہیں۔

۴۔ چوتھا طریقہ جبر اور فتح کا ہے۔ صرف فتح سے الحاق نہیں ہو جاتا بلکہ
اس کے باضابطہ اعلان یا کم از کم ایسے عمل کی ضرورت سمجھی جاتی ہے جس سے
الحاق کا منشا معلوم ہوتا ہو۔ اگر مفتوحہ علاقہ پوری مملکت پر مشتمل ہو تو پھر کسی معاہدہ
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے جدید ترین مثال حبشہ پر اٹلی کے قبضہ کی ہے۔ گو اس
کی ایک مستثنا صورت جنوبی افریقا کی بوئر سلطنت کا خاتمہ ہے جب مفتوح
لیڈروں سے معاہدہ ہوا تھا۔ لیکن اگر شکست خوردہ مالک کو اس کے چند حصوں
پر قابض اور خود مختار رکھنا ہو تو پھر صلح پر منتقل شدہ علاقے کے متعلق صریح یا معنوی
معاہدہ اس کے سابق مالک سے ہوتا ہے۔

۵۔ پانچواں اور آخری مسلمہ طریقہ یہ ہے کہ بغیر جنگ کے کسی علاقہ پر قبضہ
کر لیا جائے، تو حق قدامت بھی ملکیت پیدا کر سکتا ہے۔ عام قانون ملک کی
طرح بین الممالک تعلقات میں بھی غصب پر کوئی ملک عرصۂ دراز تک چپ رہے
تو پھر کوئی تحکیم اس کے حق کو تسلیم نہیں کرے گی۔

ص۴۷ لارنس صفحہ ۱۵۸

۹۴ کسی مملکت کو صرف اپنے ملک[1] پر ہی اقتدار حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض دیگر علاقوں پر بھی۔ جیسے کسی تابع، ماتحت یا زیرِ حمایت ریاست پر۔ مثلاً زنجبار پر انگریزوں کو اور آنام پر فرانسیسیوں کو۔ ایسی صورت میں ریاست، خارجہ تعلقات کی حد تک کسی بڑی محافظ و حامی سلطنت کے ماتحت ہوتی ہے اور اندرونی تعلقات میں کم و بیش خود مختار ہوتی ہے۔ ایسی ماتحت ریاستیں بعد میں کبھی قوت پیدا کر کے خود مختار ہو جاتی ہیں جیسے حبشہ پر ۱۸۸۹ء میں اٹلی نے اپنی حمایت جتائی۔ مگر ۱۸۹۶ء میں اطالوی فوجوں کو شکست دے کر وہ پھر آزاد ہوگئی۔[2] اس کے برعکس جزیرۂ مڈغاسکر پر فرانسیسیوں نے ابتداً حمایت قائم کی پھر وہ نوآبادی اور جزو مملکت ہوگیا۔ بعض وقت کسی کمزور ملک کو اس بات پہ مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنا کوئی خاص علاقہ کسی اور ملک کو نہ دے بلکہ خاص اسی سلطنت کو دے جس سے یہ اقرار ہوا ہو۔ چین میں برطانیا اور فرانس وغیرہ نے خاص خاص حصوں کے متعلق ایسے ہی اقرار لیے تھے چنانچہ وادی یانگتسی کیانگ برطانیا کے لیئے نامزد تھی۔ ایک اور مماثل صورت مقولۂ منرو ہے جس کے تحت دونوں امریکاؤں میں ممالک متحدہ کو اولیت حاصل ہے اور میکسیکو اور برازیل کی آزاد مملکتیں بھی مثلاً جاپان کو اراضی پٹے پر دینے

---

[1] یہ ضروری نہیں کہ پورا ملک ایک ہی جگہ ہو۔ اسی طرح مختلف حصوں کا دستور اور حکومت کا طور طریق جدا جدا ہو سکتا ہے۔ ہمارے اغراض کے لئے گھریلو حکومت اور نوآبادی دونوں ایک ہی کل کے جز ہوتے ہیں۔

[2] لارنس ص ۱۶۴

کی مجاز نہیں رہیا۔

ف ۵۰ اگر زیر حمایت علاقے میں کوئی دیسی حکومت نہ ہو بلکہ صرف قبائلی دور دورہ ہو تو ایسی حکومت کو نو آبادیاتی محمیہ[۵۱] کہتے ہیں۔ اس میں حامی حکومت قبائلی شیوخ سے معاہدے کرتی ہے اور ان کو دیگر مملکتوں سے تعلقات پیدا کرنے سے روک دیتی ہے۔ مغربی افریقا میں ابتداءً یورپی اثرات اسی قسم کے تھے۔

ف ۵۱ اسی کی ایک اور صورت وہ ہے جسے دائرۂ اثر اور بعض صورتوں میں دائرۂ مفاد کہتے ہیں۔ اگر کوئی مملکت کسی علاقے پر قبضہ کرنا چاہتی اور [illegible] ہیں ہو تو عموماً معاہدوں کے ذریعے یہ بات منوالی جاتی ہے کہ کون [illegible] کس کے اثر میں ہیں اور کہاں کس کا خاص مفاد ہے، تاکہ تصادم [illegible] گزشتہ صدی کے آخر میں انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی [illegible] کی حکومتوں نے وسطی، مشرقی اور مغربی افریقا میں اسی طرح [illegible] رقابتوں کا ازالہ کیا تھا۔[۵۲] ایران کے متعلق بھی روس اور برطانیہ [illegible] معاہدہ ہو گیا تھا مگر ایران کو خوش قسمتی سے اندرونی استحکام حاصل ہو گیا اور یہ معاہدہ بیکار ہو گیا۔

۹۳۹ھ میں نظام شاہی اور عادل شاہی حکومتوں نے [illegible] اور برار کے متعلق آپس میں اسی طرح کا معاہدہ کر کے تصادم کو روک دیا تھا۔

(دیکھئے ف ۴۱ ع ۳ اوپر)

---

۵۱ لارنس ص ۱۶۴   ۵۲ لارنس ص ۱۶۷

۵۲ کسی علاقے کو پٹے پر لینے سے بھی پٹہ دار ریاست کو اقتدار حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً حیدر آباد کے صوبۂ برار کی اس حیثیت سے لوگ ناواقف نہیں ہوں گے (۱۹۳۶ء کے نئے معاہدے میں لفظ "پٹہ" نہیں برتا گیا ہے۔) چین میں ایسا بہت ہوتا رہا ہے بعض وقت کوئی علاقہ کسی اقرار یا قرض کی ضمانت میں بھی گرو رکھا جاتا تھا۔

۵۳ ایک اور صورت مشترکہ سیادت کی ہے۔ سوڈان نے مصر سے بغاوت کی اور انگریزی مدد سے وہ دوبارہ زیر ہوا تو ۱۸۹۹ء سے وہاں مصر اور انگریزوں کی مشترکہ سیادت قائم کی گئی۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدے سے برار کا پٹہ بظاہر ختم کر دیا گیا ہے اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہاں مشترکہ سیادت قائم کی گئی ہے چنانچہ گورنر کا تقرر حیدر آباد اور انگلستان دونوں مل کر کرتے ہیں۔[1]

۵۴ علاقہ ہائے مفوضہ یا زیر انتظام بھی ایک صورت ہے کہ اقتدار اعلا تو کسی حکومت کا مانا جاتا ہے مگر انتظام کسی اور کے سپرد رہتا ہے۔ چنانچہ ایک جنگ کو ختم کرانے کے معاوضے میں انگلستان نے ۱۸۷۸ء میں ترکی سے جزیرہ قبرص اسی طرح حاصل کیا اور ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک (جبکہ ترکی سے جنگ کے باعث اس کے الحاق کا اعلان کیا گیا) اس کی یہی حالت تھی۔[2] ہندوستان میں دیسی ریاستوں سے چھاؤنیوں کے جو علاقے لئے گئے ہیں وہ بھی اسی کی ایک صورت ہیں۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ جو علاقے محض انعام

---

[1] زیادہ صحیح الفاظ ہیں وہاں منفردہ اقتدار اعلا اور مشترکہ حکمرانی قائم کی گئی ہے۔
[2] لارنس صد ۱۷۴۔

میں دیئے گئے ہیں، جیسے شمالی سرکار وغیرہ، ان کے متعلق انعام دہندہ کا اقتداً اعلاً مختتم سمجھا جائے یا اس علاقے کی حیثیت کسی عام فرد کو دی ہوئی جاگیر کے مماثل نہ سمجھی جائے۔

۵۵ کسی ملک کی رعایا اپنے ملک سے ایک سند یا منشور حاصل کرکے دیگر ممالک میں اراضی حاصل کرکے حکمرانی کے فرائض انجام دے۔ اس کی بھی صورتیں پیش آئی ہیں جیسے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی وغیرہ ایسے علاقوں پر کمپنی کے وطن کی حکومت کو بھی خاصا دخل اور اقتدار حاصل رہتا ہے۔

اختیارِ سماعت یا اقتدارِ عدالت
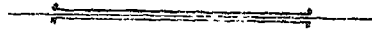
بعض نظام ہائے قانون خالص ملکی ہوتے ہیں اور بعض خالص قومی
جس مملکت کا قانون اصولاً ملکی ہوتا ہے وہ اپنے حدود ارضی میں ہر شخص اور
ہر چیز پر عدالتی اقتدار رکھتی ہے رعیت اور مستامن کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔
قانون رُوما اسی طرح کا قرار دیا جا سکتا ہے جس ملک میں قومی اصول پر قانون
بنتا ہے وہاں اس کی رعیت ہر جگہ اسی قانون کی پابند ہوتی ہے اور مستامنوں کو
ان کے وطن کے قانون سے مستفید ہونے کی آزادی دی جاتی ہے۔ اس قسم کے
نظام ہائے قانون میں شریعت اسلامیہ ایک نمایاں مثال ہے مسلمانوں میں
ابتدا ہی سے یہ بات رائج رہی ہے کہ جس مقدمے کے دونوں فریق غیر مسلم ساکنین
ملک ہوں (خواہ رعیت خواہ مستامن) وہ قانونِ شخصی کے مطابق انصاف
پانے کے مستحق ہیں اور وہ اپنی ملت کی عدالت میں رجوع ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید
(سورہ ۵ آیت ۴۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایسے اہل مقدمہ اپنی ملت
کی عدالت کی جگہ مسلمانوں کی عدالت میں رجوع ہونا پسند کریں تو پھر قانونِ
شخصی کی جگہ شریعت اسلامیہ یعنی قانونِ ملک کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ خلافتِ
راشدہ میں عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں وغیرہ کی مستقل اور علاحدہ علاحدہ
ملتی عدالتوں کا پتہ چلتا ہے جن میں رعایا اور مستامن تمام ملتوں کے لیے

عدل گستری ہوتی تھی۔ عہد اموی، عہد عباسی اور عہد ترکی (عثمانی) میں بھی یہی روا رکھا جاتا رہا۔

جیسا کہ عرض ہوا، یورپی ممالک میں "ملکی قانون" کا اصول کار فرما ہے لیکن مختلف وجوہ سے ــــ اور ممکن ہے خود اسلامی ممالک کی ہمجواری کے اثر سے ــــ وہاں بھی غیر ملک کے باشندوں کے لئے بہت سی باتوں میں قانون ملک سے استثنا منظور کیا گیا اور وہ اپنے شخصی قانون کے پابند ہوتے ہیں۔ روما میں معاہد اجنبیوں کے لئے جو خصوصی انتظام تھا وہ اس سے مختلف تھا کیونکہ ان کے ساتھ ان کے شخصی قانون کے مطابق نہیں بلکہ "قانون فطرت" کے مطابق مفتیٔ عدالت خارجہ کی صوابدید پر انصاف کیا جاتا تھا۔

۵۷ بہر حال جدید یورپی قانون یہ ہے کہ:ــــ

اولاً ہر مملکت کو اپنے حدود ارضی میں اپنی رعایا پر پورا عدالتی اقتدار حاصل ہوتا ہے رعیت بننے کا قانون اس حد تک ہر جگہ یکساں ہے کہ ماں باپ رعیت ہوں اور ان کی اولاد ان کے وطن ہی میں پیدا ہو تو وہ بھی رعیت ہوتی ہے۔ رعیت سے غیر ممالک میں ولادت ہو، والدین میں سے صرف ایک رعیت ہو، غیر ممالک کے باشندے رعیت بننا چاہیں، تصادم قوانین ہو یعنی کسی شخص کو ایک سے زیادہ قومیتیں حاصل ہوں یا وہ بے قومیت ہو جائے تو اس کے متعلق ہر مملکت میں مستقل قانون ہوتے ہیں۔ امریکا کے ایک مشہور مقدمے کا فیصلہ اکثر دہرایا جاتا ہے کہ "ہر خود مختار قوم کا یہ ایک فطرتی حق ہے کہ کس قسم کے اشخاص کو وہ حقوق شہریت عطا کرے اور اس کے لئے دستور اور قواعد

بنائے ہے نامناسب لوگوں کو اپنے میں ملانا اچھا بھی نہیں ہوتا۔

کسی علاقے کی فتح یا اور طور سے منتقلی کے بعد وہاں کے باشندوں کو مہلت دی جاتی ہے کہ اگر انھیں نئے حاکم کی قومیت منظور نہیں ہے تو ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ بعض ممالک کے قانون کے باعث بین الممالک پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے ورنہ اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہوتا۔ مثلاً کوئی اطالوی رعیت امریکا میں جا کر توطن اختیار کرے اور باضابطہ وہاں کی رعیت بن کر حقوق شہریت حاصل کرے تو بھی اطالوی قانون کے لحاظ سے وہ شخص اٹلی میں فوجی خدمت کرنے پر مجبور ہے۔ بعض ممالک کے قانون کے لحاظ سے ان کی سابق رعیت اگر جنگ میں ان کے خلاف شریک ہو تو سزائے موت کی مستحق ہے۔

کسی ملک میں علاوہ قدیم اور جدید رعیت کے سیاح، مسافر، تاجر، وغیرہ عارضی طور سے آنے والے بھی ــــ جن کو مستامن کہتے ہیں ــــ مقامی اقتدار سماعت کے تابع ہوتے ہیں خاص کر قانون فوجداری کے اغراض کے لئے مگر ان کے سیاسی حقوق اور شخصی حیثیت البتہ غیر متاثر رہتی ہے۔

۵۸۹ اشخاص کی طرح کسی حکومت کو اپنے حدود ارضی کے اندر کی اشیاء پر بھی اقتدار حاصل رہتا ہے جس میں جہاز اور طیارے بھی شامل ہیں۔ چونکہ کھلا سمندر کسی مملکت کی ملکیت نہیں ہوتا، اس لئے کسی ملک کو اپنے سرکاری اور خانگی جہازوں پر کھلے سمندر میں بھی اقتدار باقی رہتا ہے۔ البتہ غیر ملک کے

سلہ۔ فِنِک صـ۱۶۵ حوالہ ۲ (بر صفحہ مابعد)۔ ممالک متحدہ بنام وُونگ کِم آرک

"تحت علاقہ سمندر" میں ان کی حیثیت مستامن کی سی ہوگی۔

کسی ملک کو اپنی رعیت پر مطلق اقتدار باقی رہنا اب تسلیم کیا جانے لگا ہے چنانچہ اگر کوئی انگریز کسی خارجہ علاقے میں یا خارجہ جہاز پر انگلستان کے خلاف کوئی جرم کرے تو انگلستان واپس آنے پر اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض ممالک کے قانون کے لحاظ سے مثلاً کوئی روسی اپنے ملک میں حکومت اٹلی کے خلاف کوئی جرم کرے تو اس روسی کے کسی وقت اٹلی آنے کی صورت میں اس پر اطالوی حکومت مقدمہ چلا سکتی ہے۔ یوں بھی تحویل ملزم کی درخواست تو منظور نہیں کی جائے گی لیکن دوستدار ملک کی شکایت پر ایسے ملزموں کو خود مقامی حکومت نگرانی میں لے کر ریشہ سازشوں سے روک دیگی۔

چونکہ بحری ڈاکہ زنی کو انسانیت کے خلاف جرم تسلیم کر لیا گیا ہے اس لئے غیر ممالک کے بحری ڈاکوؤں کو بھی کوئی حکومت گرفتار کر کے سزائے موت دے سکتی ہے۔ کسی حربی کا کوئی سرکاری فعل بحری ڈاکہ زنی نہیں ہے اسی طرح کسی برسر جنگ مملکت کا اپنی رعایا کو غنیم پر بحری چھاپہ مارنے کی اجازت دینا جسے نیم سرکاری بحری ڈاکہ (پرائی ویٹیرنگ) کہتے ہیں اور جس کی اب معاہدات کے ذریعے عام ممانعت ہوگئی ہے ـــــ بحری ڈاکہ نہیں ہے۔

بعض استثنا

۹۵ قانون بین الممالک کے لحاظ سے کسی مملکت کو اپنے حدود اختیار سماعت میں بھی بعض اجنبیوں پر عدالتی مقدمہ چلانے کا اقتدار حاصل نہیں ہوتا ۔

۱۔ سب سے پہلے غیر ممالک کے حکمران اور ان کا ہمراہی عملہ ہے جن پر دیوانی یا فوجداری کوئی مقدمہ مقامی عدالت میں نہیں چلایا جا سکتا۔ غیر ملکی حکمران جو کہیں مہمان ہو اپنے مسکن میں مقامی حکومت کے لئے کوئی مضر کام کرے یا مفسدوں کو پناہ دے تو زیادہ سے زیادہ اس حکمران کو ملک بدر کیا جا سکتا ہے لیکن اس پر کسی طرح کا مقدمہ چلا کر سزا نہیں دی جا سکتی۔ مہمان حکمران اپنے عملے کو اثنائے سفر میں کوئی عدالتی سزا نہیں دے سکتا۔ ان پر مقدمہ چلانے کے لئے ان کے وطن کو بھیجنا ضروری ہے[1]۔ کوئی حکمران گمنام سفر کرے تو اسے یہ حقوق حاصل نہیں رہتے گو وہ ہر وقت اپنے آپ کو نمایاں کر کے اس وقت سے ان حقوق کو حاصل کر سکتا ہے[2]۔ اگر کوئی شخص کسی ملک کا حکمران ہو اور دوسری جگہ کا رعیت تو اس خاص ملک میں جہاں کی وہ رعیت ہو، اسے یہ حقوق نہیں ہوں گے۔ اس کی ایک مثال سلطان ممکلا میں جو حیدر آباد کی موروثی اور پشتینی رعیت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ڈیوک آف البنی سا کس کوبورگ گوتھا کی ریاست کا حکمران اور انگلستان کی رعیت تھا[2]۔ میگل بنام سلطان آف جوہور کی مشہور انگریزی نظیر[3] سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خارجہ تعلقات سے محروم حکمران بھی گمنام رہنے کے باوجود اقرار ازدواج جیسے شخصی فعل کی بناء پر بھی مقدمہ چلایا نہیں جا سکتا۔ امریکا کی نظیروں[4] نے

---

[1] لارنس صفحہ ۲۲۳ [2] لارنس صفحہ ۲۲۴ [3] دیکھئے اوپر صفحہ ۲۳

[4] اسکاٹ کی کتاب کیسیس آن انٹرنا شنل لا صفحہ ۲۸۵ حوالہ ۸ مقدمہ نا تن بنام ورجینیا

وفاقی ریاستوں کی جائداد کو اسی وفاق کے دوسرے اجزا میں اِسی اصول کے تحت ضبط ہو سکنے سے محفوظ کر دیا ہے۔

۲۔ دوسرے سفارتی کارندے یعنی سفیر اس کی بیوی، بچوں اور ہمراہی ملازمین اور سفارتی عملے کو بھی یہی حقوق حاصل ہوتے ہیں (دیکھئے فقرہ ۱۹۷)

۳۔ غیر ملک کی سرکاری فوجیں بھی حالت امن میں مقامی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر ہوتی ہیں مگر فوجیں صرف اجازت لے کر ہی آسکتی ہیں، خواہ اجازت پیشگی اور ہمیشہ کے لئے ہو، یا عارضی ایک بار کے لئے۔ حالت جنگ سے یہاں بحث نہیں ہے۔ سرکاری جہازوں اور طیاروں کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر کوئی مقامی ملزم کسی غیر ملکی جنگی جہاز میں سوار ہو جائے تو مقامی پولیس اسے گرفتار نہیں کر سکتی۔ ملزم کی حوالگی کا مطالبہ سفارتی ذرائع سے ہونا چاہیئے اور اگر جرم سیاسی ہو تو حوالگی عمل میں نہیں آتی بلکہ اسے پناہ دی جاتی ہے بشرطیکہ سیاسی ملزم کو بھاگ نکلنے میں مدد دینے یا اپنی پناہ پیش کرنے کی اجازت نہیں لیکن اگر ایسا کوئی شخص غیر ملکی جنگی جہاز کے پاس پہنچ کر پناہ طلب کرے تو اس سے انکار نہیں کیا جاتا۔

۴۔ خاص خاص ممالک میں مستامن مقامی حکومت کی عام عدالتوں کے اختیار سماعت سے باہر رہ سکتے ہیں۔ اوپر اسلامی قانون کا ذکر آچکا ہے قدیم سے اسلامی ملکوں میں غیر ملکی مستامنوں کو بطور رعایت اپنے ہم مذہبوں کی عدالت میں رجوع ہونے کی اجازت رہی ہے اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کو

بھی چین، ملیبار، ترکستان وغیرہ میں عدالتی علاحدگی حاصل تھی اور نہ صرف مقامی مسلمان باشندے بلکہ سیاح اور مسافر بھی دیوانی اور فوجداری معاملات میں اس عدالتِ مسلماناں میں رجوع ہوتے تھے۔ چین میں تو مسلمان کا فیصلہ مسلمان قاضی ہی کیا کرتا تھا خواہ مدعی مقامی چینی غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے قاضی کو بعض ممالک میں ہُنرمَن بھی کہتے تھے۔ [۵۱]

سلطان صلاح الدین نے مغرب اقصیٰ کی اسلامی ریاست کے مسلمان باشندوں کو بھی قومی عدالت کا حق دیدیا تھا جیسا کہ ابن جُبیر نے اپنے سفرنامے میں[۵۲] بیان کیا ہے۔

اہل یورپ کو بھی اسلامی ممالک میں خاص کر مصر اور استانبول کے تجارتی مرکزوں میں اسی طرح کی رعایتیں قدیم سے دی جاتی رہی ہیں۔ اور قونصلوں (شہبندروں) کو عدالتی اقتدارات برتنے کی اجازت دی جاتی رہی لیکن جب ان سے بے جا فائدہ اٹھایا جانے لگا اور مقامی باشندوں کو نہ صرف معاشی بلکہ بڑا سیاسی نقصان پہنچنے لگا تو ان مراعاتِ خصوصی کو

---

۵۱ عجائب الہند مولفہ بزرگ بن شہریار صفحہ ۲ تا ۱۹ نیز صفحہ ۱۴۳ ۔ مروج الذہب مولفہ مسعودی جلد ۲ صفحہ ۸۶ ۔ عرب و ہند کے تعلقات مولفہ سلیمان ندوی صفحہ ۲۷۸ تا ۲۷۹ ۔ سلسلۃ التواریخ مطبوعہ پاریس صفحہ ۱۳ ، جغرافیہ ابن حوقل صفحہ ۲۲۷ تا ۲۸ ۔ تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالیین (تاریخ ملیبار) مولفہ زین الدین المعبری مطبوعہ لزبن صفحہ ۳۵ تا ۳۶ ۔

۵۲ گب میموریل میں شائع شدہ صفحہ ۵۲

منسوخ کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ سب سے پہلے[۱] جاپان نے ۱۸۹۴ء
میں اس سے گلو خلاصی کرائی۔ ترکوں نے جنگ عظیم کے آغاز پر اس کو منسوخ
کرنے کا اعلان کیا جسے ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزان میں متعلقہ ممالک نے
بھی تسلیم کر لیا۔ ۱۹۲۸ء میں ایران کو بھی آزادی مل گئی۔ حبشہ میں بھی اب تک
یہ مراعات باقی تھے[۲] مگر اب اس کی فتح سے ان کا خاتمہ خود بخود ہو گیا۔
مصر میں مخلوط عدالتوں کو اختیارات دئے گئے ہیں لیکن اب ان کے بھی
۱۹۳۶ء کے انگریزی معاہدے کے باعث جلد ختم ہو جانے کے آثار ہیں۔
مسقط اور بحرین وغیرہ بعض ممالک میں صرف انگریزوں کو یہ خصوصی مراعات
حاصل ہیں۔ اور مسقط سے یہ معاہدہ ہے کہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے
باشندوں کے مقدمے بھی انگریزوں کی طرح انگریزی قونصل کے سامنے پیش ہوں گے[۳]

حیدرآباد میں قاعدہ یہ ہے کہ "رعیت برطانیا اہل یورپ کے
لئے حیدرآباد کا کوئی انگریزی ملازم حکومت انگریزی کے مشورے سے
اس کام کے لئے نامزد کیا جاتا ہے لیکن اگر معاملہ تصحیح یا مرافعہ کے لئے عدالت العالیہ
کو آتا ہے تو پھر وہ معمولی حکام عدالت کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ نیز ملازمین
سرکاری ان مراعات سے خارج ہیں۔[۴]
اس کے علاوہ عام طور پر دوستدار ممالک میں تحویل مجرمین کے

۱ے اوپن ہائم جلد ۱ صفحہ ۵۴ تا ۵۶ معہ حوالجات
۲ے پانگر انڈین اسٹیٹس اینڈ دی گورنمنٹ آف انڈیا) صفحہ ۹۱ تا ۹۶
۳ے ضابطہ فوجداری حیدرآباد باب ۲۸

کے معاہدے بھی ہوتے ہیں۔ تیرہ صدی قبل مسیح مصر نے جو معاہدہ کیا تھا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حالیہ زمانے میں جو معاہدے ہوئے ہیں ان میں عموماً تین باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے:۔

۱۔ بادی النظر اور سرسری تحقیقات میں جرم ثابت ہو۔

۲۔ جس خاص الزام کے تحت تحویل عمل میں آئی ہو اس کے سوائے کسی اور الزام کے تحت تحقیقات عمل میں نہیں آئے گی۔

۳۔ الزام کسی سیاسی جرم کے متعلق نہ ہو۔

اس قسم کے معاہدات کا منشا چوری، قتل وغیرہ کے مقدموں میں ملزمین کو جن سے کسی مہذب اور امن پسند حکومت کو ہمدردی نہیں ہو سکتی کیفر کردار تک پہنچانا ہوتا ہے۔ سیاسی جرم کو عام جرائم سے ممتاز کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں نیت ذاتی فائدے کی نہیں بلکہ ملک کی عام بھلائی کی ہوتی ہے۔

مساوات

واقعہ صلحنامۂ ویسٹ فالیا سے پیچھے یہ میثاق مجلس اقوام تک یہ برابر تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ قانون بین الممالک کا اصل اصول خود مختار سلطنتوں کی باہمی مساوات ہے۔ اس سے مراد قوت اور اثر میں نہیں بلکہ مرتبے اور قانونی حقوق میں برابری ہے۔ گو بھیڑیے اور بھیڑ کے بچے میں ندی پر پانی پیتے وقت جو واقعہ پیش آیا، اس کی مماثل بہانہ سازیاں بدقسمتی سے اشرف المخلوقات میں بھی کچھ کم نہیں رہی ہیں۔

لیکن جس طرح کسی علمی یا سماجی جلسے میں چند ہی نمائندے پیش پیش رہتے ہیں اور باقی کسی نہ کسی رہنما کے پیچھے چلتے ہیں، اسی طرح سلطنتوں کے سماج میں بھی چند با اثر سلطنتیں ہوتی ہیں۔ اور چھوٹے اور کمزور ملک بہت سی باتوں میں کسی نہ کسی جتھے میں شریک ہو جاتے ہیں اور بڑی سلطنتوں کے اشارں پر چلتے ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ رائے یا مفاد کی یکسانی کے باعث کسی کا ساتھ دینا اور بات ہے، اور مخالفت نہ کر سکنا اور ہے۔ اگرچہ کوئی ذمہ دار شخص کھلم کھلا کہنا نہیں چاہتا لیکن واقعہ تو یہی ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ جب تک

اخلاقی قوتوں کو فتح ہو کر حکومتیں خود ہی ظلم و زبردستی چھوڑ نہ دیں، یا کسی مرکزی قوت، مثلاً مجلس اقوام کا ڈر ان کو راست روی پر مجبور کیا ہوا نہ رکھے، اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ آندھی کے بہاؤ کے رُخ کا تنکا ساتھ نہ دے۔

نپولین کی واٹرلو میں شکست کے بعد یورپ میں نئی جتھا بندی شروع ہونے لگی اور انگلستان، فرانس، آسٹریا، پروشیا (جو بعد میں بزرگ جرمنی میں ضم ہو گیا) اور روس، یورپ کی کشتی کی ناخدائی کیا کرنے لگے کہ دنیا سے اپنی مرضی منوانے لگے۔ بعد میں اٹلی کی قوت نے اس کو بھی اس زمرے میں جگہ دلا دی۔ جنگ عظیم کے بعد آسٹریا کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن امریکا اور جاپان کے اثرات نے عالمگیر سیاست میں بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ گو ان میں بھی پھوٹ اور جتھا بندی ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ چھے ملک کوئی بات منظور کر لیں تو وہ تمام دنیا کی منظوری کے مماثل ہو جاتا ہے۔

مقولۂ منرو کی بھی یہی توجیہ ہو سکتی ہے۔ نہ صرف امریکا کی خود مختار ریاستوں میں بلکہ دنیا کی اور سلطنتوں میں بھی اتنی ہمت نہیں ہے کہ ممالک متحدہ امریکا سے لڑائی مول لیں۔ جاپان نے میکسیکو (جنوبی امریکا) میں کچھ زمین پٹے پر لینی چاہی لیکن صرف ممالک متحدہ امریکا کی مخالفت سے کام بن نہ سکا حالانکہ پٹہ دہندہ اور پٹہ دار دونوں راضی تھے۔ اسی طرح فی الحال یہ ممکن نہیں کہ کوئی ملک چین میں جاپان کے مفاد کے خلاف کچھ دخل دے سکے۔ ۱۸۸۹ء سے "اتحاد امریکا" کی باضابطہ اور سرکاری کوشش مسلسل جاری ہے۔ فرانس کے وزیر خارجہ موسیو بریاں نے "اتحاد یورپ" کی قدیم

تجویز کو حال ہی پھر تازہ کیا تھا۔ اسلامی اور عرب ممالک کا اتحاد ایک جدید ترین تحریک ہے جو جارحانہ سے زیادہ دافعانہ مقاصد پیش نظر رکھتی ہے۔

۹۳ بہرحال بڑی سلطنتوں کی رائے اور منشاء کا چھوٹی اور مفاد دار سلطنتیں بہت کچھ لحاظ کرتی ہیں۔ لیکن جائداد، عدالتی اقتدار اور سفارتی تعلقات کے حقوق اور فرائض کی حد تک سب خود مختار ممالک مساوی سمجھے جاتے ہیں، اگرچہ خارجی تعلقات یا معاہدات کی حد تک ہمسایہ بڑے ممالک کے منشا کا لحاظ ذاتی اغراض و مفاد کے باعث رکھا جاتا ہے۔ اس مساوات کا سب سے نمایاں مظاہرہ استقبالی مراسم میں ہوتا ہے۔ مثلاً توپوں کا چلنا، اعزازی محافظ دستے کا پیش کیا جانا وغیرہ۔ مساوات بعض وقت ناممکن ہوتی ہے مثلاً معاہدے پر پہلے دستخط کرنا یا جلسے میں بیٹھنا۔ ایسی صورتوں میں ملکوں کے ناموں میں حروف ہجا کا لحاظ رکھ کر یا کسی اور طور سے مشکل کو حل کیا جاتا ہے۔ کسی ملک کا جنگی جہاز کسی غیر ملک کے ساحلی قلعے یا بندرگاہ کے پاس سے گزرے تو جنگی جہاز پہلے سلامی دیتا ہے پھر خشکی سے اس کا مساوی جواب دیا جاتا ہے۔ البتہ اگر جہاز میں حکمران یا سفیر موجود ہو تو پہلے جہاز کو سلام کیا جاتا ہے دو مختلف ملکوں کے جہازوں کی مڈبھیڑ ہو تو جس جہاز کا کمانڈنگ افسر چھوٹا عہدہ رکھتا ہو وہ پہلے سلامی دیتا ہے۔ تجارتی جہاز جنگی جہاز کو پہلے سلامی

---

[۱] ڈیوبوا نے اتحاد ممالک نصرانیہ کی تحریک ۱۳۰۵ء میں پیش کی تھی اور سلی کی تحریک اتحاد یورپ کے متعلق ۱۶۰۳ء میں پیش ہوئی تھی۔ تفصیلوں کے لئے دیکھئے اوپن ہائم ج ۱ ص ۶۵ تا ۶۶

دیتا ہے۔

بین الممالک سلامی اکیس ۲۱ گولوں سے زیادہ کی نہیں ہوتی اور سلام کا جواب مساوی دینا ہوتا ہے۔ کسی ملک میں شاہی استقبال پر زیادہ توپیں چلتی ہیں۔

سفارتی تعلقات

ف۶۳ انسانوں کی احتیاج باہمی شروع ہی سے رہی ہے [illegible] انسانی ضروریات
اور ذرائع برابر بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ چونکہ قدرتی خزانے ہر جگہ یکساں نہیں ہیں
اس کا ناگزیر نتیجہ خود مختار سیاسی وحدتوں کا روز افزوں [illegible] اور
باہمی استفادہ ہے۔

ایلچیوں کا بھیجنا تمدن انسانی میں بڑی قدیم چیز ہے [illegible] حال حال
تک سفارتیں صرف خاص اغراض کے لئے بھیجی جاتی تھیں [illegible] اور
نبی جو انسانوں کے لئے خدا کے پیغام رساں ہو کر آئے تھے [illegible] مستقل سفارت
تھی۔) یہ سرکاری اور علانیہ سفارتوں کا ذکر ہے مستقل [illegible]
قدیم ہیں اور قریب قریب ہر ملک میں نظر آتے ہیں۔

ف۶۴ تاریخ سفارت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے [illegible]
باہمی احتیاج زیادہ تھی وہاں نہ صرف معاشی بلکہ [illegible]
سیاسی ضرورتوں سے جلد جلد سفیروں کے بھیجنے کا رواج ہوا [illegible]
میں سفیر کو تین سے چار مہینے تک مرسل الیہ کے پاس ٹھیرنا [illegible]
مدت میں برابر اضافہ ہی ہوتا گیا۔ (ہندوستان میں [illegible]
ہاں انگریزی اور دوسرے سفیروں کو دو دو سال [illegible]

اور سیاسی اہمیت کے باعث عیسائی یورپ کے ہر حصے سے انکے ہاں بھی اظہار اطاعت کی سفارتیں آیا کرتی تھیں، اور پوپ کے نمائندے بھی ... عیسائی بادشاہوں کے ہاں متعین ہوا کرتے تھے۔ چودھویں صدی سے اٹلی میں مستقل سفارتوں کی شکل نظر آنے لگتی ہے۔ اور پندرھویں صدی میں فرانس کے لوئی یازدہم (۱۴۶۱ء تا ۱۴۸۳ء) نے اس کو زیادہ عام کیا۔ اور سولھویں صدی سے وہ ناگزیر ادارہ بن گئیں۔

۶۵۔ ادھر مشرق میں گیارھویں صدی کے اواخر سے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ خلفائے بغداد کے نمائندے "ماتحت" مسلمان حکمرانوں کے ہاں اور ان کے نمائندے دربار خلافت میں مستقل طور سے متعین رہتے ہیں اور اپنے بھیجنے والے کے مفاد کی نگرانی کرتے ہیں[۵]۔ یہ سفارتیں اس وقت تک ملکی نہیں بلکہ شخصی تھیں یعنی حکمران کا لحاظ تھا اُس کی وفات پر نیا حکمران تجدید کرتا تھا۔ سفارت مملکت کی طرف سے نہیں ہوتی تھی یہی حال یورپ میں بھی رہا۔

۶۶۔ یوروپ میں اٹلی اور خاص کر وینیس اور فلارنس اپنے تجارتی تعلقات کے باعث خارجہ معاہدات اور سفارتوں میں سب سے پیش پیش رہے ہیں اور ان کے سفیروں میں دانتے اور ماکیاویلی جیسے نام بھی ملتے ہیں۔ جب ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر لیا، اور ترکی سیلاب سے سارا یورپ گھبرانے لگا تو پروفیسر ہیس (ص ۳۰۶) کے مطابق یورپ میں آپس کے

---

[۵] امیر علی، باب "خلافت عباسیہ پر نظر باز گشت"

جھگڑے چھوڑ کر امداد باہمی کی بڑی ترغیب ہوگئی۔ تجارتی تعلقات کے سلسلے میں وینیس کے نمائندے استانبول بھی پہنچے اور وہاں سرکاری حفاظت میں شہبندر (قونصل) کے فرائض انجام دینے لگے۔ وزارت ہائے امور خارجہ کے قیام کے بعد ہی مستقل سفارتیں عام ہوتی چلی گئیں اور سولھویں صدی عیسوی کے شروع ہی میں یورپ میں ان کا کافی رواج نظر آتا ہے۔ مگر ان مستقل سفارتوں کے باوجود غیر معمولی نمائندے وقتاً فوقتاً بھیجے جاتے رہے ہیں۔

۶۷ ابتداءً غیر ممالک کے نمائندے ایک ہی قسم کے ہوتے تھے اور ان کو سفیر (امبا سیڈر) کہا جاتا تھا جو اپنے ملک کے بادشاہ کی ذات اور معاملات کی نمائندگی کرتے تھے۔ پھر مختلف وجوہات سے اور فرائض کے اختلاف کے لحاظ سے کئی قسم کے غیر ملکی سرکاری نمائندے ہونے لگے۔ ان کے ناموں اور کاموں میں انیسویں صدی کی ابتدا تک مختلف ممالک میں بڑا التباس رہا۔ اس کی الجھن کو چھوڑ کر موجودہ تقسیم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ خود مختار ممالک میں بہ لحاظ درجہ چار قسم کے سفارتی نمائندے ہوتے ہیں :۔

۱۔ سفیر جو اپنے ملک کے حکمران کی ذات اور معاملات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

۲۔ فرستادۂ سیاسی (ایلچی)، وکیل مختار کل (منسٹر پلینی پوٹن شیری) یا دیگر کارندۂ خارجہ جو کسی ملک کے حکمران کے دربار میں متعین کئے جاتے ہیں۔

۳۔ وکیل مقیم (منسٹر ریزیڈنٹ) جو حکمران کے پاس متعین ہوتے ہیں

۴۔ نگران خارجہ (شارژے دافیر) جو کسی غیر ملک کے وزیر خارجہ

کے پاس متعین کیے جاتے ہیں۔) یہ اپنا خریطۂ تقرر حکمران ملک کے

بالا ... پیش نہیں کرتے۔

... سفیر ہوتا ہے بڑے ممالک بڑے ملکوں میں مقرر کرتے ہیں۔ یورپ میں

... تھیں تو امریکا کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ امتیاز باقی

نہیں ... کہ چھوٹے ممالک میں یورپ کے نمایندوں کو ——— جنہیں

... کا نام دیا جاتا ہے ——— سفیروں کے برابر سمجھے

... اور وہ بھی قصرِ قانتیکان میں اپنے سفیر بھیجتے ہیں۔

... مختار سلطنتوں کی باہمی سفارت کا ذکر تھا۔ جزءً مختار ممالک

... ممالک جو نمایندے بھیجتی ہے، وہ عموماً مندوب اعلا

... کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء کی آزادی کے بعد مصر میں انگریزی

... متعین کیا گیا تھا ——— اب وہاں سفیر مقرر ہے۔ اسی طرح عراق اور

... ممالک میں دورانِ انتداب میں ہائی کمشنر مقرر رہے

... کا نمایندہ لندن میں اسی نام سے موسوم ہے اور جنوبی افریقا

میں ... کا کارندۂ سیاسی (ایجنٹ) کا نام رکھتا ہے۔

... ممالک میں جنہیں خارجہ تعلقات کی اجازت نہ ہو حامی

ملک کے نمایندے عموماً مقیم سیاسی (رزیڈنٹ) یا مقیم عام (رزیڈنٹ جنرل)

... ہندوستان کی بڑی ریاستوں میں انگریزی رزیڈنٹ مقرر ہیں

... آباد کا شمار جزءً مختار ممالک میں ہوتا ہے۔ سلطان مراکش

اور بائی تونس کے حضور میں فرانسیسی "مقیم عام" ہوتا ہے۔

ف سفیروں کو نامزد کرکے ہمیشہ اس ملک کی منظوری لے لی جاتی ہے جہاں انہیں جانا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر مملکت دنیا کی ہر مملکت میں سفارت جیسا خرچیلا دفتر قائم کرے۔ بعض وقت کئی ملک مل کر اپنا مشترکہ سیاسی نمایندہ مقرر کر دیتے ہیں اور بعض وقت جب تعلقات کی کشیدگی کے باعث سفارتی تعلقات توڑ لیئے جاتے ہیں تو کسی دوستدار ملک کے سفیر کو اپنے معاملات کی نگرانی بھی سونپ دیتے ہیں۔

ف تعلقات منقطع کرکے سیاسی نمائندے کو واپس بلا لینا عموماً سخت کشیدگی یا جنگ کے موقع پر ہوتا ہے۔ لیکن دوستی کے باوجود بھی معقول وجوہ پر کسی ملک کے کسی شخص کو بطور سفیر قبول کرنے سے انکار کیا جا سکتا ہے یا واپس بلانے کے لیئے کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً چارلس اول کے سفیر ڈیوک آف بکنگھم کے باردوم فرانس بھیجے جانے پر اس بنا پر اعتراض کیا گیا تھا کہ اس نے سابقہ موقع پر ملکۂ فرانس سے عشق بازی کی تھی [1] اسی طرح کسی شخص کے خیالات کا کسی ملک کے خلاف ہونا مشہور ہو تو بھی اس کے تقرر کو نامنظور کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اگر مجوزہ نمایندۂ سیاسی اگر مرسل الیہ ملک کا باشندہ ہو تو یہ بھی معقول عذر ہے لیکن اگر ابتداءً اعتراض نہیں کیا گیا، تو بعد میں اعتراض قبول نہیں ہوگا۔ چنانچہ جب سر ہالیڈے مکارٹنی چینی سفارت کے معتمد کی

---

[1] لارنس صفحہ ۲۷۸ بحوالہ گارڈنر

حیثیت سے لنڈن آیا تھا اور سنہ ۱۸۹۰ء میں اس کو سفارت کے بعض حقوق سے انگریز ہونے کی بنا پر محروم کرنے کی کوشش ہوئی تو یہی عذر کیا گیا کہ تقرر کے وقت اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔[۱] حیدرآباد میں مسٹر (حال سر ریجنالڈ) گلانسی کو رزیڈنٹ مقرر کرنا چاہا گیا تو جلالت مآب حضور نظام نے یہ اعتراض کیا کہ وہ پہلے حیدرآباد کی ملازمت میں رہ چکے ہیں۔ پسندیدہ شخص بعد میں سفارتی فرائض اور وقار کے خلاف کام کرے تو اس کی واپسی کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

دستاویزات نمائندۂ سیاسی کو اپنے ملک کی حکومت سے منزل مقصود کو روانہ ہوتے وقت متعدد دستاویزیں دی جاتی ہیں:۔

۱۔ خریطۂ تقرر جس میں نام و اغراض کے علاوہ مرسل الیہ سے مناسب برتاؤ کی استدعا ہوتی ہے۔ سفیر اور وکیل کی صورت میں حکمران ملک کے دستخط اور حکمران ملک کا پتہ لکھا جاتا ہے۔ نگران کی صورت میں وزیر خارجہ کی طرف سے مرسل الیہ کے وزیر خارجہ کو لکھت ہوتی ہے۔

۲۔ ان سیاسی نمائندوں کو دستاویز اختیارات دی جاتی ہے، اگر انھیں کسی کانفرنس میں صلح یا معاہدہ کرنے کے لئے شریک ہونا ہو۔

۳۔ حالت امن میں معمولی پاسپورٹ اور حالت جنگ میں غنیم کے ملک کو جاتے وقت وہاں کی حکومت کا امن نامہ بھی دیا جاتا ہے۔

---

[۱] لارنس صفحہ ۲۷۹

۴۔ بعض وقت زبانی لیکن عموماً تحریری ہدایات بھی دئے جاتے ہیں جو اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر کسی کو دکھائے نہیں جاتے۔ اب اکثر اہم معاملوں میں گھر کی حکومت سے ٹیلیفون، تار یا خط پر مشورہ بھی ہوتا رہتا ہے اور بعض وقت سیاسی نمائندے کسی چیز کو "بشرط استصواب" بھی قبول کر لیتے ہیں۔

ف ۴۳ سیاسی نمائندہ منزل مقصود کو پہنچ کر وہاں کے وزیر خارجہ کو اپنے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔ سفیر کو حکمران ملک دربار عام میں باریاب کر کے خریطہ تقرر وصول کرتا ہے۔ وکیل کو دربار خاص میں حکمران کو صرف وزیر خارجہ کے پاس باریاب ہو کر تقرر نامہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اور ہر صورت میں بہی خواہی اور خوش آمدید کی رسمی تقریریں ہوتی ہیں۔

ف ۴۴ سیاسی نمائندے کو گھر سے چلتے ہی بہت سے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں اور غیر ملک کے جہاز پر بھی اگر وہ سفر کرے تو وہ اپنے ملک کا جھنڈا لہراتا ہے۔ خاص خاص مراعات جو مقامی ہوتے ہیں، خریطہ دربار کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔

ف ۴۵ واپسی کے وقت بھی "خریطہ بازطلبی" کے لئے حکمران یا وزیر خارجہ جیسی کہ صورت ہو، سیاسی نمائندے کو باریاب کرتے ہیں اور سفیروں کو چلتے وقت انعام و اکرام دینا اب چھوٹ گیا ہے۔

ف ۴۶ کسی شخص کی حیثیت نمائندگی مختلف طور سے ختم ہو سکتی ہے۔ مرسل اور مرسل الیہ میں جنگ چھڑ جائے تو سفارتی تعلقات توڑ کر دفتر اور عملہ واپس منگا لیا جاتا ہے۔ سفیر کی وفات اور بازطلبی کے علاوہ اس کے منصرم ہونے

کی صورت میں اصل اور مستقل افسر کے آ جانے پر نیز اگر سفارت کسی عرصے یا غرض کے لئے معین ہو تو وقت گزر جانے اور کام ختم ہو جانے پر بھی کسی شخص کی نمائندگی کا اختتام ہو جاتا ہے۔ اور وہ عموماً اپنے ملک کو واپس ہو جاتا ہے۔

مرسل یا مرسل الیہ اگر کوئی بادشاہ ہو تو اس کی وفات پر تقرر نامے کی تجدید عمل میں آتی ہے۔ صدارت جمہوریہ کی صورت میں مرسل اور مرسل الیہ کے عوض حکومتوں کے نام ہوتے ہیں۔ اس لئے نئے انتخاب صدر پر تقرر نامے کی تجدید کی ضرورت نہیں۔

۹۷۷ سیاسی نمائندوں کو اور ان کے متعلقین کو شخصی و مالی دونوں مراعات حاصل ہوتے ہیں متعلقین میں بیوی، بچے، عملہ دفتر، مذہبی افسر (امام یا پادری)، نامہ بر وغیرہ شامل ہیں اور عموماً سفارت خانے سے وقت بوقت مقامی حکومت کو ایسے لوگوں کی مکمل فہرستیں بھیجی جاتی ہیں۔ اور عموماً سفارت خانے میں مقامی اشخاص بھی غیر اہم عہدوں پر ضرور ملازم رکھے جاتے ہیں۔ انھیں بھی دوران ملازمت سفارت میں مراعات حاصل رہتے ہیں۔

۹۷۸ شخصی مراعات کا مطلب یہ ہے کہ وہ مقامی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر ہوتے ہیں۔ ماتحت ملازمین پر دیوانی نالش ہوتی ہو تو افسر سفارت عموماً اجازت دیتا ہے۔ فوجداری جرم اگر سفارت خانے کے باہر اور ادنا ملازم کریں تو بعض وقت ان کو فوراً برطرف کر کے سفیر اُن کو مراعات سے محروم اور مقامی عدالتی اقتدار سماعت میں دیدیتا ہے۔ اور بعض وقت بلا برطرفی، مقامی

پولس کے سپرد کر کے مقدمہ چلانے کی اجازت دیدیتا ہے۔ ایسی صورتوں میں عموماً گھر کی حکومت سے استصواب کر لیا جاتا ہے۔ بعض دوسری حالتوں میں خطاکار مقدمہ چلانے کے لئے وطن بھیج دیا جاتا ہے۔

شخصی آزادی میں یہ بھی شامل ہے کہ سفارت گاہ میں نمائندۂ سیاسی کو مذہبی عبادت کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ البتہ اہل ملک کو شرکت عام کی اطلاع کی غرض سے گھنٹے وغیرہ بجانے کی اجازت نہ ہوگی، اگر قانون ملک کی رُو سے اس طرح کی عبادت ممنوع ہو۔ عہد نبوی میں نجران کے عیسائی وفد کو مدینے میں خود مسجد نبوی کے اندر اپنی عبادت بجالانے کی اجازت دی گئی تھی[۱۸]۔

ف ۷۹ مالی آزادی میں سب سے پہلے اس کا مسکن ہے جس میں مقامی حکومت کے عہدہ دار گھسنے کے مجاز نہیں۔ گو سخت کشیدہ تعلقات کی صورت میں تلاشی اور کاغذات وغیرہ کی ضبطی کے لئے اس آزادی کو باقی نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح سفارت گاہ کی عمارت پر محکمۂ بلدیہ وغیرہ کو کوئی محصول نہیں دئے جاتے۔ گو شرافت کا یہ تقاضا سمجھا جاتا ہے کہ برقی روشنی، گاس، پانی وغیرہ کے بل ادا کئے جائیں جس طرح بازار سے کچھ خرید نے پر ____ لیکن ان تمام صورتوں میں عدم ادائی پر متضرر کوئی قانونی چارہ کار اختیار نہیں کر سکتا۔ سفارت خانے کا اسباب بھی مراعات سے مستفید ہوتا ہے۔

ف ۸۰ علاوہ ان چار قسم کے سیاسی نمائندوں کے جن کا اب تک ذکر

---

[۱۸] سیرۃ ابن ہشام ص ۴۰۲، طبقات ابن سعد جلد اول حصہ دوم ص ۵۵

ہوتا رہا، مجلس اقوام کی شرکت کے لئے جانے والے نمائندوں اور ہیگ کی مستقل بین الممالک "عدالت" کے ججوں کو بھی اب معاہدات کے باعث وہی مراعات دئیے جاتے ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا۔

قونصل

۸۱۔ تجارتی نمائندے جو شہبندر (قونصل) کہلاتے ہیں نسبتہً کم مراعات پاتے ہیں۔ وہ اپنے مسکن پر اپنی حکومت کا جھنڈا اور مونوگرام نمایاں کر سکتے ہیں۔ مسکن پر محاصل بلدیہ وغیرہ نہیں دیتے۔ لیکن وہ کسی ملزم کو پناہ نہیں دے سکتے اور مقامی حکومت کے مطالبے کی صورت میں پناہ گزین کی حوالگی پر مجبور ہیں۔ بعض وقت قونصل مرسل الیہ ہی کی رعایا ہوتا ہے۔ مثلاً جنگ عظیم تک مدراس میں ترکی قونصل ایک مدراسی مسلمان ہی تھا۔

یہ ممکن ہے کہ کسی نگران سیاسی ہی کو قونصل بھی بنایا جائے۔ ایسی صورت میں پھر اسے جملہ سفارتی مراعات حاصل رہیں گے۔ وسطی اور جنوبی امریکا کی جمہوریتوں میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے۔

۸۲۔ سفارتی تعلقات کا ایک بڑا منشا معاہدات کا طے کرنا ہوتا ہے۔ معاہدے کرنے کا مجاز ہر مملکت کا وہ ادارہ ہوتا ہے، جس کی مرضی پورے ملک کے لئے پابندی عاید کرتی ہے۔ عملاً اس طرح کا ادارہ اپنا ایک بااختیار نمائندہ چنتا ہے۔ اور اس کا مرادضہ (یعنی عارضی راضی نامہ) توثیق کے لئے حکومت کے پاس آتا ہے۔ اس کی وجہ عموماً یہ ہوتی ہے کہ گفت و شنید کرنے کے اختیارات ملک کے دو مختلف محکموں کو حاصل ہوتے ہیں، توثیق عموماً ملک کی پارلیمان

کرتی ہے۔ اور مراوضہ وزارت خارجہ کی جانب سے عمل میں آتا ہے۔ اور یہ بارہا ہوا ہے کہ مراوضے کی توثیق نہیں کی گئی اور وہ کالعدم ہو گیا۔

معاہدہ توثیق پانے اور نافذ ہونے کے بعد بھی اس کے شرایط کے متعلق اکثر بحث ہوتی ہے اور بعض وقت ایک سے زاید زبانوں کے متن کو مساوی وقعت دینے سے بھی مشا متعین کرنے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء کا معاہدۂ حیدرآباد و برطانیا فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے سنہ ۱۹۱۹ء کا معاہدۂ ورسائی انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں ہے اس کے برخلاف یمن اور اٹلی کا معاہدہ مثلاً، عربی اور اطالوی دونوں زبانوں میں ہے، لیکن اختلاف کی صورت میں عربی متن کو مستند قرار دیا گیا ہے۔ تعبیر اور تاویل کے قواعد بنانا آسان نہیں ہے۔

معاہدوں کے متعلق عام اصول تو یہی ہے کہ اس کی شرطوں کی پوری پابندی ہونی چاہیئے اور ان شرطوں میں فریقین کی منظوری کے بغیر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو شرایط بزور کسی فریق سے منائے جاتے ہیں ان کے متعلق اکثر دیکھا گیا ہے کہ کمزور فریق کے اپنے سنبھالا لیتے ہی یکطرفہ اعلان کے ذریعہ نظرانداز کردیئے گئے۔ فریق ثانی میں اگر ہمت ہوتی ہے تو بدلہ لیتا اور نئے سر سے مجبور کرتا ہے ورنہ اپنا سا منہ لے کر چپ ہو رہتا ہے۔ صلح نامۂ ورسائی کی ہٹلری دور میں جو دھجیاں بکھری ہیں اس سے سب واقف ہیں۔ ایسی صورتوں میں دنیا کی رائے عامہ ایک حد تک فریق معاہدہ شکن سے ہمدردی محسوس کرتی ہے۔ لیکن وہ صورتیں بھی کم نہیں، جب محض طمع و آز کے تحت قوی

سلطنت اپنے اقرار و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر کمزور کی کمزوری سے مزید فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایسی صورت میں دنیا کی رائے عامہ معاہدہ شکن کو سرّاً یا جہراً لعنت ملامت کرتی ہے۔ لیکن :—

"جسے فضیحت کی نہ ہو پروا، اُسے کیا کہے کوئی"! ابھی دنیائے انسانی میں یہ ممکن نہیں ہوا کہ صریح ظلم و جبر کے خلاف بھی مل کر بڑا اجمایا جائے، اور زبردست کو حق رسانی پر مجبور کیا جائے۔

یہاں میثاق مجلس اقوام کی دفعہ ۱۹ کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی مجلس عام وقتاً فوقتاً اپنے ارکان کو اُن معاہدوں کی نظر ثانی کا مشورہ دیگی جو ناقابل عمل ہو گئے ہوں، اور جن پر اصرار امن عالم کے لئے خطرہ ہو سکتا ہو ــــ لیکن یہ دفعہ عملاً بیکار رہی ہے، کیونکہ مجلس عام کے فیصلوں کا بہ اتفاق تمام ہونا ضروری ہے، ایک بھی اختلافی رائے اس کو بے اثر کر سکتی ہے اور جب فریقین معاہدہ میں تبدیلی پر اتفاق ہو تو پھر مجلس اقوام کی سفارش کی کوئی ضرورت نہیں۔ میثاق مجلس اقوام کی دفعہ ۱۸ کے لحاظ سے جو معاہدہ شائع نہ ہو اور مجلس اقوام میں رجسٹر نہ کرایا جائے وہ قابل پابندی نہیں ہوگا ــــ یعنی اس کی تعمیل میں مجلس اقوام مدد نہیں دیگی۔ موجودہ بے بسی کے دور ہی میں نہیں، اس کے زور و شور اور بلند بانگ دعووں کے زمانے میں بھی جب اسی کے مقرر کردہ ایک غیر جانب دار کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی کہ موصل ترکی کا جزء لاینفک ہے، تو مجلس اقوام نے اپنے جلسۂ عام

میں طے کیا کہ "لیکن وہ ایک انگریزی انتداب یعنی عراق کی حفاظت (منفعت ؟) کے لئے چونکہ ناگزیر ہے، اس لئے وہ ترکی کو [illegible] دیا جائے" ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی ؟

اور جس حبشہ کو اس نے "مدد" دی وہ کتنا کام آئی ؟

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ

دشمنوں سے نبٹنے کے لئے سدا تیار رہو

مخاصمانہ تعلقات

۸۳۔ "قانون بین الممالک کا وہ جزء جس کی سب سے کم تعمیل ہوا کرتی ہے وہ یہی ہے۔ اس لئے مختصر طور سے صرف اس کے اہم خدوخال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ دو خود مختار مملکتوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ مسالمانہ اور دوستانہ نہیں رہتے ان میں جھگڑے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جھگڑوں کا تصفیہ اگر باہم گفت و شنید سے نہ ہو سکے تو بعض وقت قوت استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن ایسی ہر صورت جنگ نہیں ہوتی۔ چنانچہ نہ تو فریقین اپنے کو حربی قرار دیتے ہیں اور نہ دوسری مملکتوں کو غیر جانب دار کے فرائض اور بوجھ سے لادتے ہیں۔ سفارتی تعلقات برقرار رہتے ہیں اور غیر مقاتلوں کو حریف ملک سے تجارت بند کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔

۸۴۔ اس طرح کی پہلی صورت دھمکی اور دباؤ ہے جس میں کوئی ملک جنگی مظاہرہ کرتا ہے اور کبھی کبھی محدود علاقے میں کوئی جنگی فعل مثلاً بمباری بھی کرتا ہے۔

لیکن جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔[115]

۸۵ بعض وقت حریف کے تجارتی جہازوں کو اپنی بندرگاہ میں بند کر دیا جاتا ہے اور بعض وقت خود حریف کی ایک یا زائد بندرگاہوں کی ناکہ بندی کر کے آنا جانا روک دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۸ء میں جزیرہ اقریطش (کریٹ) میں بغاوت ہوئی تو ترکوں نے بجائے سزا دہی کے صرف بحری محاصرہ کر کے شورش کو دبا دیا تھا۔[1] اس کے برخلاف ۱۸۲۷ء میں جب یونان میں بغاوت ہوئی تو برطانیا، فرانس اور روس نے یونان کا بحری محاصرہ کر لیا تاکہ ترکی فوج کو رسد اور کمک نہ آنے سے ترکی حکومت مجبور ہو کر ان کی ثالثی پر آمادہ ہو جائے۔[2] اس صورت میں محاصرین محض خدائی فوجدار تھے، ان کے فعل کو کوئی قانونی جواز حاصل نہیں ہو سکتا۔ بعض وقت کسی دباؤ اور جبر کا جواب مساوی درجے کی کارروائی سے دے کر انتقام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے امریکا میں جاپانیوں کے توطن کی ممانعت ہو گئی تو جاپان نے بھی اسی طرح کے بلکہ اس سے سخت قانون اپنے ہاں نافذ کر دیے ہیں۔ محصول درآمد کی شرحیں ایسی صورت میں اکثر بڑھائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ سیاسی تعلقات کا انقطاع، معاہدوں کا التوا یا دباؤ کا کوئی اور ذریعہ بھی حسب ضرورت اختیار کیا جاتا ہے۔ معاشی دباؤ میں ضروریات زندگی کی برآمد کو روکنے کے علاوہ حال میں جرمنی نے اپنے باشندوں کا آسٹریا میں سیاحت

---

[1] اوپن ہائیم صفحہ ۱۳۵ [2] لارنس صفحہ ۳۱۶

کے لئے جانا عملاً روک دیا تھا۔ اس سے آسٹریا کو بڑی آمدنی تھی۔

۸۶۔ مخاصمانہ تعلقات کی سب سے بڑی اور اہم صورت جنگ ہے۔ اس کی تعریف لارنس نے یہ کی ہے کہ دو یا زائد مملکتیں یا مملکات نما جماعتیں سرکاری فوجوں کی مدد سے اس نیت کے ساتھ مقابلہ کریں کہ اپنے باہمی پُر امن تعلقات کو ختم کر کے مخاصمانہ تعلقات قایم کریں ——— اس تعریف میں نیت اور مقابلے پر زور دیا گیا ہے اور خانگی افراد کو یہ حق نہیں ہے کہ دشمن پر بجز مدافعت کے چھاپہ مارا کریں۔

اوپن ہائم کی تعریف یہ ہے کہ دو یا زیادہ مملکتوں میں مسلح فوجوں کے ذریعے مقابلہ جس میں ہر فریق اپنے حریف کو نیچا دکھا کر اس سے اپنی مرضی منوانے کی نیت رکھتا ہو۔

۸۷۔ پرانے زمانے میں جنگ اکثر بغیر کسی اعلان کے شروع کی جاتی تھی اور حریف پر انجان دھاوا بول کر نقصان پہنچایا جاتا تھا۔ اسلام نے سوا سزا اور انتقام کے اور صورتوں میں بلا اعلان جنگ کو سختی سے روکا ہے۔ جدید یورپی نظریہ یہ ہے کہ صریح اعلان جنگ یا مشروط نہائیہ (الٹی میٹم) پہنچنے کے بعد جنگ شروع کی جا سکتی ہے۔ اعلان تار پر بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن ضرورت ہوتی ہے کہ دیگر ممالک کو بھی فوراً آگاہ کیا جائے تاکہ غیر جانبداروں کے فرائض اور حقوق کا لحاظ کیا جا سکے۔

فوری اثرات اعلان جنگ

۸۸۔ جنگ کے چھڑتے ہی محاربی مملکتوں کی رعایا کے بین الاقوامی

تعلقات میں بھی خود بخود اہم تبدیلی ہو جاتی ہے۔ سفارتی تعلقات اگر پہلے ہی نہ ٹوٹ چکے ہوں تو اب ٹوٹ جاتے ہیں۔ مگر سفیروں کو امن و امان سے واپسی کی اجازت دی جاتی ہے۔ قونصلوں کو اپنا کام بند کرنا پڑتا ہے۔ ہر فریق کے سرکاری مسلح افواج کو حق مل جاتا ہے کہ قوانین جنگ کے مطابق حریف کو ہر طرح کا نقصان پہنچائیں۔ اگرچہ غنیم کے غیر مقاتل افراد (بچے، بوڑھے، اپاہج، عورتیں، غیر جنگی آبادی وغیرہ) کو ضرر پہنچانے کی بہر روپ میں ممانعت بتائی جاتی ہے۔ لیکن:—

۱۔ جبری فوجی تعلیم اور بھرتی کا عام رواج ہے اور عورتیں بھی بہت کچھ ہاتھ بٹاتی ہیں۔ روس کے بعد اب ترکی میں زنانہ پلٹنیں بھی تیار ہو رہی ہیں۔

۲۔ ہوائی تاخت (بم اور گاس سے حملہ) روز افزوں ہے۔

۳۔ دستوریت کے عام ہونے کے باعث اعلان جنگ کی ذمہ داری پوری قوم پر ہوتی ہے۔

۴۔ معاشی دباؤ ڈالنے کے لئے دشمن کے مواصلات کے قطع کرنے کی اجازت سے سب ہی متاثر ہوتے ہیں۔ بہرحال منشا یہ ہے کہ غیر مقاتلوں کو عمداً نشانہ بنانے کی کوشش نہ کی جائے، وہ زد میں آ جائیں تو مجبوری ہے۔

اعلان جنگ کے بعد ایک حربی ملک کی رعایا غنیم کی رعایا سے کوئی میل جول نہیں کر سکتی اور اپنے ملک کے مفاد کے خلاف معاملات نہیں کر سکتی۔ حریف کو کوئی مدد یا سہولت نہیں پہنچانی چاہئے اور نہ وہاں کے قرضوں کے حصے خریدنے چاہئیں۔ اپنے ملک کے جنگی نقشے یا تجاویز سے حریف

کو اطلاع دینی غداری ہوگی۔ غرض بڑی حد تک ایک حربی کی رعایا بھی دوسرے حربی کی رعایا کی دشمن ہوتی ہے۔ مگر اب اس میں وہ شدت نہیں رہی جو سابق میں ہوا کرتی تھی۔ تجارتی تعلقات کے متعلق یہ رجحان ہے کہ ہر حربی اپنی رعایا کے متعلق قواعد بنا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک حریف ملک سے تجارتی کاروبار جاری رکھ سکتی ہے۔ امانتوں اور قرضوں کی حد تک انگریزی قانون یہ ہے کہ دشمن کی رعایا سے دیون کی بازیافت کا حق اور ان کی جانب سے نالش کا دائر ہوسکنا، دوران جنگ میں ملتوی ہو جاتے ہیں۔ البتہ صلح کے بعد دوبارہ کارگر ہو جاتے ہیں۔ سرکاری قرضوں کی حد تک ایک امین مقرر کیا جاتا ہے اور اقساط اس کی تحویل میں دئے جاتے ہیں، حریف کو فوراً نہیں ملتے۔ اور عموماً مفتوح مملکت کو اپنے قرضوں کی بازیابی سے دستبرداری بھی دینی پڑتی پڑتی ہے۔

مستامن

۸۹ حریف مملکت کے جو افراد رعایا کسی حربی ملک میں اعلان جنگ کے وقت ہوتے ہیں ان کو گزشتہ جنگ عظیم میں بعض ممالک نے قید کر دیا، بعض نے قلیل مہلت دے کر خارج کر دیا۔ چونکہ بالقوہ وہ مقاتل ہو سکتے ہیں، اس لئے رجحان یہ ہے کہ ان کی نظربندی یا سخت نگرانی رکھنی چاہیے، دوران جنگ میں اپنے وطن کو واپس جانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔

اعلان جنگ کا اثر معاہدوں پر

۹۰ کسی معاہدے کے

دو فریق بھی ہو سکتے ہیں اور زیادہ بھی۔[119] اور کسی جنگ میں یہ ممکن ہے کہ کسی معاہدے کے سب فریق شریک جنگ ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایک جنگ میں شریک ہوا ہو۔

پہلے ہم ان معاہدوں کا ذکر کریں گے جن کے بعض فریق کسی جنگ میں غیر جانب دار رہیں۔ لارنس ان کی دو بڑی قسمیں کرتا ہے: غیر معمولی اور معمولی۔

۹۱ف (ا) اول الذکر کی چار صورتیں ہوتی ہیں:—

۱۔ جب کہ بنائے جنگ کو معاہدۂ سابق کی تجویزوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۶ء میں معاہدۂ پاریس میں ترکی سے متعلق بہت سی باتیں طے ہوئی تھیں اور سنہ ۱۸۶۶ء میں پروشیا اور آسٹریا میں جو معاہدۂ مذکور کے دو بڑے شریک تھے، جنگ چھڑی۔ معاہدۂ مذکورہ پر اس جنگ کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

۲۔ جبکہ بنائے جنگ کو معاہدۂ سابق سے کوئی تعلق تو نہ ہو لیکن اس کی تعمیل میں جنگ سے دشواری پیدا ہو جاتی ہو۔ مثلاً اسی معاہدۂ سنہ ۱۸۵۶ء میں فرانس نے علاوہ اور سلطنتوں کے ترکی کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی سے جنگ کے باعث فرانس کا حال اس قدر زار ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داری کو اگر ادا کرنے کی ضرورت پڑتی تو ناکام رہتا۔ ایسی شرطیں کسی مملکت کی ناقابلیت کے دوران میں معطل ہو جاتی ہیں، گو دیگر دستخط کنندگان معاہدہ پر وہ نافذ رہتی ہیں۔

۳۔ چونکہ معاہدہ سابق کی شرطیں ہی بنائے جنگ ہوں تو فریقین
جنگ کی حد تک تو معاہدہ کالعدم ہو جاتا ہے لیکن غیر جانبداروں پر
اثرات غیر معین ہیں اور زیادہ تر ان کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۵ء
کر کے جنگ اثر کا دیں اور سابقہ شرطوں کے مطابق ہی عمل رکھیں یا جیسے
رہیں۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں جب روس اور ترکی میں جنگ چھڑی
تو ۱۸۵۶ء کے معاہدے کے دیگر فریق دوران جنگ میں تماشا دیکھتے
رہے اور اس کے اختتام پر مطالبہ کیا کہ صلح نامہ مرتب کرنے میں ان کو بھی
شریک رکھا جائے کیونکہ سابقہ معاہدے کی (جس میں وہ شریک تھے)
ترمیم ہو رہی تھی۔ ترکی میں اگر قوت ہوتی تو اس مطالبے کو ٹھکرا دیا جاتا۔
۴۔ طرز عمل جنگ کے متعلق جو معاہدے ہوتے ہیں وہ جنگ کی
ابتدا پر نافذ ہوتے ہیں۔ مثلاً حقوق و فرائض غیر جانبداران وغیرہ
جیسے راضی نامے ہیں۔

۹۴۔ (ب) معمولی معاہدے اگر اتفاقی نہیں تو کالعدم ہو جاتے
ہیں جیسے متحدہ ملکوں کا باہم جو الحاق۔ اعلان جنگ سے یہ معاہدہ کالعدم
ہو جاتا ہے۔ جنگ کے باوجود بھی کوئی معاہدہ فریقین جنگ میں آپس
میں تو نہیں لیکن غیر جانبداروں یا باہم غیر جانبداروں اور ہر ایک
فریق میں بہت سی صورتوں میں جنگ کے دوران قابل عمل ہوتا اور نافذ رہتا ہے
جیسا کہ اکثر تجارتی معاہدوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈاک و تار وغیرہ کا
بھی اسی سلسلے میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔

جب کسی معاہدے کے جملہ فریقوں میں جنگ چھڑی ہو تو ان کی بھی دو بڑی قسمیں ہیں: غیر معمولی اور معمولی۔

۹۳ (ج) اوّل الذکر کے سلسلے میں:۔

۱۔ اگر جنگ کو شرائط معاہدہ سے کوئی تعلق نہ ہو تو بھی وہ دوران جنگ میں معطل ہو جاتے ہیں۔ اور جنگ کے بعد کا صلحنامہ سابقہ معاہدہ یا اس کے کسی جزو کو صراحتاً یا سکوت کے ذریعے باقی رکھے تو حسبہ عمل ہوگا۔ چنانچہ ۱۸۷۸ء کے معاہدۂ برلن، بلغاریہ یا جبل اسود، رومانیا، سربیا کی سرحدوں اور بہت سی دوسری باتوں کے متعلق ہوا تھا۔ جنگ عظیم میں معاہدۂ مذکور کے سب دستخط کنندہ لڑائی میں شریک ہو گئے اور ختم جنگ کے صلحناموں میں معاہدۂ برلن کی بعض دفعات کی صراحت سے تنسیخ کی گئی۔ کیونکہ یوگوسلاقیا اور چیکوسلفاکیا کی نئی سلطنتیں وجود میں لائی گئیں۔

۲۔ جن معاہدوں میں جنگ کی صورت میں طرز عمل کا ذکر ہوتا ہے وہ نافذ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ بنائے جنگ سابقہ معاہدے ہی کی شرطیں ہوں تو معاہدہ کالعدم ہو جاتا ہے اور ختم جنگ پر نئے سرے سے انتظامات ہوتے ہیں مثلاً بلجیم کو غیر جانب دار بنانے کا معاہدہ سنہ ۱۸۳۹ء میں ہوا تھا۔ جنگ عظیم میں جرمنی نے اس کی خلاف ورزی کی تو انگلستان وغیرہ جنگ میں کود پڑے۔

۹۴ (د) سابقہ معاہدے کی فریقوں میں ہی اگر جنگ چھڑ جائے اور وہ معاہدہ معمولی امور کے متعلق ہو تو اس کی چار قسمیں ہیں :-

۱- موقتی معاہدے جو کسی خاص کام کو انجام دینے کے لئے ہوتے ہیں، مثلاً معاہدہ تعین سرحد یا تسلیم خود مختاری وغیرہ تو محض اعلان جنگ سے ایسے معاہدے میں ترمیم نہیں ہو جاتی خواہ نتیجہ جنگ اس میں تبدیلی کرائے۔

۲- معاہدہ حلیفی و امداد باہمی ظاہر ہے کہ فوراً کالعدم ہو جاتا ہے۔

۳- معمولی تعلقات مثلاً تحویل ملزمین، تجارت وغیرہ کے معاہدے دوران جنگ میں تو معطل ہو جاتے ہیں اور ختم جنگ پر اگر ان کو منسوخ یا بدل نہ دیا گیا تو خود بخود دوبارہ کارگر ہو جاتے ہیں۔

۴- طرز عمل جنگ مثلاً تبادلۂ اسیراں وغیرہ کے متعلق معاہدے اب نفاذ حاصل کرتے ہیں۔

دشمن اشخاص و اشیاء

۹۵- دشمن ہونے کی حیثیت ایک ایسی صفت ہے جو اشخاص کو بھی حاصل ہوتی ہے اور اشیاء کو بھی، زیادہ مقدار میں بھی اور کم مقدار میں بھی۔ ہر ایک کے احکام مختلف ہیں۔

۹۶- ۱- غنیم کی بری، بحری یا ہوائی فوج میں جو لوگ ہوں خواہ

غنیم کی رعایا یا غیر جانب دار ممالک کے رضا کار ـــــــ درجہ اوّل کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ مقابلے کے وقت ان کو قید، زخمی اور قتل کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ غنیم کے ملک کے تجارتی جہاز ران بھی بڑی حد تک دشمن ہیں۔ لیکن اگر یہ مقابلہ نہ کریں تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ گرفتار کر کے قید رکھا جا سکے گا۔ اگر گرفتار کنندہ چاہے تو ان سے یہ تحریری اقرار لے کر کہ وہ جنگ میں کوئی حصہ نہ لیں گے، رہا کر سکتا ہے۔ ہیگ کانفرس نے غیر جانب دار قوم کے جہاز ران ہونے کی صورت میں مزید رعایت کی سفارش کی ہے۔

۳۔ وہ لوگ جو فوج میں شریک ہوتے ہیں لیکن لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیتے، مثلاً سند یافتہ نامہ نگاران صحافت، گتہ دار، اسباب فروش تاجر وغیرہ نیز جو لوگ صرف اعزازی طور سے یا دل بڑھانے کے لئے آتے ہیں مثلاً شاہی خاندان کے افراد یا وزراء وغیرہ، ایسے لوگ غنیم کے ہاتھ میں پڑیں تو نظر بند کر دیئے جا سکتے ہیں اور ان سے جنگی قیدیوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔

۴۔ دشمن کے ملک کے ساکنین خواہ اہل ملک ہوں یا اجنبی متامن، اگر یہ لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیتے ہوں اور اس علاقے پر غنیم کا عارضی قبضہ ہو جائے تو فاتح نہ صرف ملکیوں بلکہ غیر جانب دار متامنوں سے بھی رقمی مطالبے کر سکتا اور اسباب یا احتیاج فراہم کرنے نیز حسب ضرورت کوئی شخصی خدمت انجام دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن جوں ہی ایسا قبضہ ختم ہو جاتا ہے وہاں کی رعایا خود بخود سابقہ حکومت کی معمولی رعایا ہو جاتی ہے، ان کو اب غنیم

کے ملک کے ساکنین نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ جنگ عظیم کے دوران میں انگریزی قانون سازوں نے اس کے ناگزیر نتیجے کے طور پہ یہ حکم دیا کہ دشمن سے تجارت نہ کرنے کا جو حکم دیا جائے اس کی پابندی ان لوگوں پر بھی واجب ہے جن کی بستی پر عارضی طور سے دشمن کا قبضہ ہو جائے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کس حد تک اس کی تعمیل ممکن ہے ۔

۵ ۔ غیر جانب دار ممالک کے وہ باشندے جو کسی حربی ملک میں کاروبار رکھتے ہوں اگرچہ وہ خود اپنے وطن ہی میں رہیں ، ایسے لوگوں کا مال ساکنین ملک کے مال کی طرح جنگ سے متاثر ہوگا ۔ البتہ شخصی طور سے ان کو کوئی گزند نہ پہنچایا جائے ۔

۶۷ ۔ اب تک اشخاص کا ذکر ہوا ۔ اشیاء کے سلسلے میں :-

۱ ۔ غنیم ممالک کی سرکاری جائداد مثلاً جہاز ، اسلحہ ، اور جنگ میں کام آنے والی چیزیں ہاتھ لگیں تو ضبط یا تباہ کر دی جا سکتی ہیں ۔

۲ ۔ لیکن غنیم کی رعایا کی خانگی جائداد چاہے خشکی میں ہو یا جہازوں میں ، قدیم زمانے میں لوٹ لی جا سکتی تھی ۔ اب خشکی کی جائداد کو عام حالات میں قبضے یا فتح پر لوٹ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ۔ گو ان باشندوں سے رقم اور سامان احتیاج مہیا کرنے کے مطالبے کئے جا سکتے ہیں ، جیسا کہ آیندہ ذکر ہوگا ۔ لیکن جو سامان سمندر میں جہازوں پر ہے وہ اب تک کسی ضبطی سے بری نہیں سمجھا جاتا ہے ۔ ہاں اعلان جنگ پر کسی ملک کی بندرگاہ میں غنیم کے ملک کا کوئی خانگی جہاز ہو تو استیمان کے باعث اس کو وطن واپسی تک

اثرات جنگ سے خارج رکھنے کے متعلق اسلامی قاعدہ اب یورپ میں بھی کچھ عرصے سے مان لیا گیا ہے۔

۳۔ حربی کا مال غیر جانب دار جہازوں اور غیر جانب دار کا مال حربی جہازوں میں جو اثرات پیدا کرتے ہیں، نیز کسی حربی مالک میں طویل توطن (حقوق شہریت حاصل کئے بغیر) — ایسے امور ہیں جن کے متعلق بڑا اختلاف رائے ہے اور اب تک کوئی اتفاق اور یکسوئی نہیں ہو سکی ہے اس کے پیچیدہ مسائل اس مختصر تبصرے کے لئے موزوں نہیں۔

دشمن اشخاص سے برتاؤ

ف ۹۸۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ کوئی مملکت اپنے علاقے میں مقیم مستامنوں سے کیا برتاؤ کرتی ہے جبکہ ان کی حکومت سے جنگ چھڑ جائے۔ قدیم اسلامی قانون یہ تھا کہ پاسپورٹ کے شرائط پر مستامن کے مالک سے جنگ کا چھڑنا کوئی اثر نہیں کرتا۔ اگر معاہدات نہ ہوں تو نظر بندی یا اخراج کا حق، آج کل ہر مملکت کے لئے محفوظ سمجھا جاتا ہے گو اخراج کو فوجی نقطۂ نظر سے ناپسند کیا جاتا ہے۔

ف ۹۹۔ دشمن کے علاقے کے ساکنوں میں مقاتل اور غیر مقاتل کا جو امتیاز مسلمانوں میں عہد نبوی سے کیا جانے لگا تھا وہ ویسٹ فالیا کے عہد نامے (۱۶۴۸ء) تک یورپ میں مانا نہیں جاتا تھا۔ اور عہد نبی سے پہلے ...

راہب، قیدی سب ہی مباح الدم سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد سے مقاتل وغیر مقاتل میں اور لشکری اور کشوری آبادی میں امتیاز پر زور دیا جانے لگا۔ لیکن ہوائی حملوں اور دور زد توپوں وغیرہ کے باعث یہ فرق پھر سے ناقابل عمل ہوتا جا رہا ہے۔

۱۰۰ف۔ جنگ کی بے رحمیوں کو کم کرنے کے لئے مغرب میں پہلی کوشش جو رضاکارانہ اور یک طرفہ تھی، امریکا میں ہوئی اور سنہ ۱۸۶۳ء میں ممالک متحدہ امریکا نے اپنی فوجوں کے لئے ہدایتیں مرتب کیں۔ متحدہ کوششوں کا آغاز سنہ ۱۸۷۴ء سے ہوا۔ اس سنہ میں بروسیل کانفرنس میں اور سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۷ء کی پہلی اور دوسری ہیگ کانفرسوں میں، نیز دیگر اس اثنا میں منعقد شدہ سرکاری وغیرسرکاری کانفرسوں میں بہت سے نرم قواعد منظور ہوئے لیکن ان میں ایک تو "غیر مہذب" غنیم کے لئے کوئی حق نہیں تھا۔ اور دوسرے انتقام میں یہ تمام ممنوعات پھر جائز ہو جاتے تھے۔ پھٹنے والی گولیوں اور روائح قاتلہ (مہلک اور زہریلے دھوئیں) نہ برتنے کا جن مملکتوں نے اقرار کیا تھا، خود ان کا طرز عمل مثلاً جدید ترین حبشی اطالوی جنگ میں جو رہا، وہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے خوشنما قواعد کس قدر قابل عمل ہوتے ہیں۔

چند عام چیزیں جن کا کافی لحاظ کیا جاتا ہے، یہاں بیان کی جا سکتی ہیں:

۱۰۱ف۔ دشمن سپاہی لڑتے لڑتے اگر ہتھیار ڈال دیں اور سفید جھنڈا اڑا کر

امان طلب کریں تو خونریزی فوراً بند کردی جاتی ہے اور دشمن کو "جوار" دیدیا جاتا ہے۔

- -

- -

- -

ف ۱۰۱ جنگی قیدیوں کا قتل ممنوع ہونے کے بعد غلام بنا سکنا عرصے تک رائج رہا۔ ہاب ہاؤز کا (دیکھئے کتاب مارلس ان اِفالیوشن) بیان ہے کہ رومیوں کے ہاں غلام سے جو برتاؤ ہوتا تھا، عیسائیت نے آکر اس کو بدتر اور سخت تر کردیا اور یہ کہ مختلف ممالک میں غلاموں سے سلوک جو بہتر ہوا وہ براہ راست اسلامی اثرات کا نتیجہ تھا۔ (اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے دیکھئے میری کتاب، "رومی اور اسلامی ادارۂ غلامی" شائع کردۂ بزم قانون جامعۂ عثمانیہ) جسٹس اکبر یار جنگ کا خیال ہے کہ اسلام میں غلاموں کی قطعی ممانعت نہ ہونے کا بڑا باعث یہ تھا کہ تمام دنیا میں بردہ فروشی جاری تھی۔ اور بین الممالک کاروبار کی یکطرفہ ممانعت ممکن نہیں۔ ابتدا سے جو اسلامی قانون رہا ہے اسے تسلیم کرکے اب ان کی غذا اور لباس قید کنندہ حکومت پر واجب ہوتی ہے۔ انھیں عبادتی آزادی دی جاتی ہے۔ یوروپی رواج ہے کہ ان سے غیر جنگی کام لیا جاسکتا ہے نیز معرکہ کارزار سے دور قلعوں، خندقوں وغیرہ کی تعمیر کے اور مماثل کام لئے جاسکتے ہیں۔ ختم جنگ پر عموماً مفتوح ملک فاتح کو اس کے اخراجات قیدیاں کی بھی تلافی کرتا ہے۔ اعلا فوجی افسروں اور دیگر معززین کے ساتھ

قید ہونے پر اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی اور ان کے آرام کا حتی الامکان لحاظ کیا جاتا ہے۔ ان کے ہتھیار اور جنگی کاغذات تو چھین لئے جا سکتے ہیں لیکن ان کی شخصی چیزیں انہیں کے پاس رہنے دی جاتی ہیں۔ بلکہ ان کو تنخواہ بھی دینے کا حکم ہے۔ اگر کسی جنگی قیدی کو یہ کہہ کر رہا کر دیا جائے کہ وہ جنگ میں کوئی حصہ نہ لے گا اور وہ اقرار شکنی کرتا ہوا دوبارہ گرفتار ہو تو اسے بطور مجرم کے جنگی عدالت میں پیش کیا جا سکیگا۔ قیدیوں کی نگرانی کی جا سکتی اور نا فرمانی پر تعزیری سزا دیجا سکتی ہے جو قیدی کسی بچن کے بغیر فرار کی کوشش کرے تو سزا دیجا سکتی ہے لیکن اگر وہ دشمن کے علاقے سے بھاگ اور بچ نکلے یا اپنی فوج یا امن میں پہنچ جائے اور پھر دوبارہ گرفتار ہو تو سابقہ فرار پر کوئی سزا نہیں دی جائیگی۔ بیمار اور زخمی قیدیوں کی تیمارداری کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے۔ بیمار اور زخمی دشمن کو گرفتار کرنے میں البتہ کوئی امر مانع نہیں، اور مثلاً اگر کوئی جہاز ان کو لیجا رہا ہو اور دشمن کو موقع ملے تو ان کی حوالگی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ فاتح افسروں پر یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ میدان جنگ اور دواخانے میں مرنے والے دشمنوں کے جسم پر جو شخصی سامان ہو، وہ جمع کر کے حریف ملک کو متوفی کے وارثوں کے لئے بھیج دے۔

۱۰۳۹۔ زخمی اور بیمار سپاہیوں کی مدد کے لئے خواہ کسی فریق جنگ کے ہوں اب عام طور سے ہلال احمر اور صلیب احمر اور مماثل رضاکار ادارے کام کرتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف انسانیت کی خدمت ہوتا ہے۔ ان کے

کام میں عام طور سے کم رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔

بحری جنگ میں زخمی یا بیمار اور جہاز شکستوں کو امداد دینے کے لیئے جو جہاز ہوتے ہیں وہ یا تو سرکاری ہونگے یا خانگی یا غیر جانب دار علاقے کے۔ ایسے جہاز سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور ان پر حربی مملکت کا ہونے کی صورت میں سبز، اور خانگی یا غیر جانب دار ملک کا ہونے کی صورت میں سرخ چوڑی پٹی اختیار کی جاتی ہے۔ ایسے جہازوں پر علاوہ ان کے قومی جھنڈوں کے ہلال احمر یا صلیب احمر کا جھنڈا بھی ہوتا ہے۔ غیر سرکاری اور غیر جانب دار جہازوں کو کسی حربی فوج میں امدادی کام کرنے کے لیئے اس کے افسر کے ہدایات کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے جہاز اگر ذرا بھی جنگی کام کریں، مثلاً جاسوسی، پیام رسانی وغیرہ تو پھر ان کے ساتھ جو تھوڑا بہت مراعات کا سلوک کیا جاتا ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ موقع ملنے پر گرفتار اور ضبط کر لیئے جا سکتے ہیں۔

عموماً ڈاکٹر، نرس اور مذہبی پادری، امام وغیرہ کو گرفتار ہونے پر قید نہیں کیا جاتا بلکہ اپنا کام جاری رکھنے کی سہولت بہم پہنچائی جاتی ہے۔

غیر جانب دار تجارتی یا خانگی جہاز یا علاقے میں کوئی بیمار یا قیدی پناہ لے تو حربی ان کی حوالگی کا مطالبہ کر سکتا ہے لیکن اگر غیر جانب دار جنگی جہاز میں وہ پناہ لیں یا غیر جانب دار علاقے میں کسی حربی کے تندرست سپاہی بھاگ کر چلے جائیں تو عموماً ان کو نظر بند رکھا جاتا ہے اور دوبارہ اپنے ملک کی فوج میں دوران جنگ میں جا ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور

نہ ہی ان کے حریف ملک کے سپرد بطور قیدی کے کیا جا سکتا ہے۔

ف۱۰۸۔ کسی مفتوحہ شہر کو لوٹنا، جلانا، یا آبادی کا قتل عام کرنا اب روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اور عام طور پر ضرورت سے زیادہ کشت وخون اور بے رحمی یا سختی نہیں کی جانی چاہیئے۔

دشمن کی جائداد سے برتاؤ

ف۱۰۹ اپنے علاقے میں جب دو مملکتوں میں جنگ چھڑے تو ایک کے علاقے میں دوسرے حریف کی جو جائداد ہوگی وہ یا تو سرکاری ہوگی یا نجی۔

ف۱۱۰ سرکاری جائداد حریف ملک کی سرکاری جائداد اگر منقولہ قسم کی ہو مثلاً رقم، جہاز، ذخیرہ، اسلحہ، ریل کے ڈبے یا انجن اور مماثل چیزیں تو ضبط کرلی جا سکتی ہے۔ سفارت خانے کی چیزوں کو عموماً باہمی مفاد کی خاطر چھیڑا نہیں جاتا۔ لارنس کی رائے میں کسی ملک کی سرکاری غیر منقولہ جائداد کسی غیر ملک میں نہیں ہوتی سوائے سفارت خانوں کے۔ لیکن ہماری تاریخ میں اس کے خلاف بہت سی عجب صورتیں ملتی ہیں۔ مثلاً مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بعض اور اسلامی ممالک کی طرح حکومت حیدرآباد کی بھی رباطیں ہیں گو یہ وقف کی صورتیں ہیں۔

اورنگ زیب نے اورنگ آباد کو پائے تخت بناتے وقت وہاں

حیدر آباد کو بعض جنگ کی صورتیں پیشوا وغیرہ کی ریاستوں سے پیش آئی ہیں اور حیدر آبادی طرز عمل ایسی صورتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوران جنگ میں خواہ نگرانی، پابندی وغیرہ عائد کی جائے لیکن بعد صلح اگر زیر بحث جائداد کا مالک موجود ہے تو اس کے حقوق کا پھر احیاء عمل میں آجاتا ہے۔

ت: خانگی جائداد اعلان جنگ پر حریف ملک کی مستامن رعایا کی جو خانگی جائداد کسی مملکت میں پائی جاتی ہے، وہ منقولہ بھی ہو سکتی ہے اور غیر منقولہ بھی۔

اصلی یعنی غیر منقولہ جائداد یورپ میں اٹھارویں صدی سے پہلے ضبط کر لی جاتی تھی۔ لیکن اب بجز شاذ استثناؤں کے عام طور پر ایسی جائداد دوران جنگ میں قرق کر کے قبضے میں رکھی جاتی ہے، ضبط نہیں کی جاتی۔ شخصی یعنی منقولہ جائداد کے متعلق بھی عرصے تک بڑی سختی رہی۔ اٹھارویں صدی کے بہت سے معاہدوں میں اس بات کا انتظام کیا گیا کہ اعلان جنگ پر غنیم کی رعایا کو اپنا تجارتی مال ایک معینہ عرصے میں لے جانے کی اجازت دی جائے۔ انیسویں صدی سے شاذ ہی ضبطی عمل میں آئی ہے اور قرقی عموماً ختم جنگ پر اٹھالی جاتی رہی ہے۔

دوران جنگ میں اگر کوئی مستامن غنیم کے ملک میں رہے تو اسے عام طور پر عدالت میں چارہ جوئی کی اجازت نہیں دی جاتی گو اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔ ختم جنگ پر انصاف طلبی کی دوبارہ اجازت ملتی

ہے تو چند ترقی یافتہ ممالک میں معطلی کا یہ عرصہ میعاد سماعت کے اغراض کیلئے شمار نہیں کیا جاتا۔ امریکا میں یہی قانون ہے، انگلستان میں بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہی قانون ہے [۱]

کسی ملک کے سرکاری طور سے اجرا کردہ قرضے کے حصے غیر ملک کے باشندے خریدیں تو بھی جنگ چھڑنے پر ایسے حصے ضبط نہیں کئے جاتے بلکہ ان کا سود وغیرہ برابر ادا کئے جاتے رہتے ہیں، کیونکہ جنگ کے باعث مٹا دن کم ہو کر ادا طلب رقم گھٹ جاتی ہے۔ جنگ عظیم میں ایسی ادائیاں عام طور پر ملتوی رہیں۔

ف ۱۰۸ غنیم کے ملک میں دشمن کی جائداد جو مقبوضہ علاقے میں ملے اس کے سلسلے میں غنیم سے میدان جنگ میں یا پڑاؤ یا قلعے سے جو چیزیں ملیں وہ مال غنیمت کہلاتی ہیں۔ اور عموماً ان کا بڑا حصہ اصل (یا ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت) فاتح فوج میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ حکومت اور فوج کا تناسب مقرر نہیں۔ مسلمانوں کے ہاں ۴/۵ فوج میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس نے جو قواعد کارزار مقرر کئے تھے ان کی دفعہ ۱۴ یہ تھی کہ غنیم سپاہیوں کے شخصی استعمال کی جو چیزیں چھینی جائیں وہ دفتر معلومات کے ذریعے اصل مالکوں یا ان کے وارثوں کو واپس کر دی

---

[۱] عالمی کا قانون معاہدہ (نواں انگریزی اڈیشن) صفحہ ۱۱ مع حوالہ

جائیں اس طرح کے کاغذی قاعدوں پر جس حد تک عمل ہو سکتا ہے وہ اس سے
ظاہر ہے کہ اس کی ایک بھی مغربی مثال لارنس کو نہیں مل سکی۔ سنہ ۱۹۰۴ء
میں جاپان نے مغربی تہذیب کے نئے نئے جوش میں اس پر البتہ عمل کیا تھا۔
انیسویں صدی تک یورپ میں جنگ سے نفع نہیں تو کم از کم اس کے
اصلی اخراجات کو غنیم کے ملک کے ذرائع سے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔
اس کے لئے جس قدر ظلم و ستم ہوتا ہوگا ظاہر ہے۔ اس کے بعد سے اس میں کم از کم
چند بڑے ممالک کی حد تک کسی قدر نرمی ہوئی ہے۔ اور فتح اور فوجی قبضے میں
فرق کیا جانے لگا ہے۔ مفتوحہ علاقے کا جب فاتح اپنے ملک سے الحاق کرے
تو پھر وہاں سے وہ اسی طرح برتاؤ کریگا جس طرح اپنے ملک کے کسی حصے
سے۔ اگر صرف قبضہ ہو تو حقوق مالکانہ کی جگہ حقوق استفادہ حاصل ہوتے
ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسخر شدہ علاقے کے باشندوں کو خود ان کے اپنے ملک
کی فوج سے لڑنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن فاتح غنیم ان کو بہت سے
کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ چنانچہ یورپ کی جنگ عظیم میں ——— فریقین
کے الزاموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ——— یہ عام بات رہی ہے کہ غنیم کی آتش
باری میں پیش قدمی کے وقت خندقیں کھودنے کے لئے اسی طرح کے قیدیوں
کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ مسخر شدہ علاقے کے باشندے اگر فاتح کے ساتھ امن
امان کا سلوک رکھیں تو عموماً ان کے ساتھ بھی کافی نرمی کی جاتی ہے لیکن
اپنے ہم وطنوں کے لئے جاسوسی یا فاتح کو اور طور سے نقصان پہنچانے کی کوشش
کی جائے تو اپنی جان کو جوکھم میں ڈالنا ہوتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا، سرکاری غیر منقولہ جائداد پر فوجی قابضوں کو انتظام
اور استفادے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ملکیت کا نہیں۔ چنانچہ ٹیکس اور کرائے
وصول کئے جا سکتے ہیں، سرکاری مکانوں بلکہ خود گرجوں کو فوجی کام میں لایا
جا سکتا ہے، مگر فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بے ضرورت تباہی اور
بربادی کی مہذب دشمن سے توقع نہیں کی جاتی، خاص کر تاریخی اور اثری
عمارتوں کو عمداً نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔

ف۱۰۹۔ منقولہ سرکاری جائداد ـــــ جس میں نقد رقم اور دستاویزات
قابل تقوم بھی شامل ہیں ـــــ البتہ قابض دشمن کی ملکیت میں آ جاتی
ہے۔ گو فنون لطیفہ، تاریخ اور اثریات کے نوادر کو مال غنیمت بنانے کی ممانعت
کی گئی ہے لیکن اس پر صرف اسی حد تک عمل ہوتا ہے کہ مفتوح سے ایسی
لوٹی ہوئی چیزیں واپس لی جاتی ہیں اور بس (مثلاً [illegible])
فوجی قبضے سے جہاں یہ حقوق حاصل ہوتے ہیں [illegible]
بھی ہوتا ہے کہ زیر اقتدار علاقے میں [illegible] امن عامہ [illegible] قائم
رکھی جائے اور مقامی آمدنی کا [illegible] صرف [illegible]

ف۱۱۰۔ غیر سرکاری غیر منقولہ جائداد پر قابض فوج کو کوئی حق ملکیت حاصل
نہیں ہوتا۔ گو ان میں فوجوں کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ سخت فوجی ضرورت یا
شرارت پر تنبیہ کے لئے ان کو تباہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ منقولہ جائداد بھی ضبط [illegible]
کی جا سکتی۔ گو اسلحہ، آلات خبر رسانی، نقل و حمل [illegible]
موٹر، ریل، غبارے، جہاز، ذخیرہ [illegible] لئے جا سکتے [illegible]

ختم جنگ پر متضررین کو اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ گو اس کا بار عموماً مفتوح پر ہی ڈالا جاتا ہے۔

ف ۱۱۱ مسخر شدہ علاقے کے باشندوں سے جو رقم یا مال حاصل کیا جا سکتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں، فراہمیٔ غذا، جنگی چندے، اور جرمانے۔ ہر فوجی افسر اس مقام کے باشندوں کو جہاں وہ ہو، اپنی فوج کے لئے اشیاے مایحتاج مہیا کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ اسی طرح سپہ سالار متعلقہ (جنرل) کی اجازت سے جنگی امدادی چندے دینے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ مایحتاج اور رقم کی جو اس طرح وصول ہو، مہیا کنندہ کو اکثر رسید دی جاتی ہے لیکن اس کی واپسی یا معاوضہ ختم جنگ پر عموماً مفتوح ملک پر تاوان جنگ کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔

جرمانوں کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسخر شدہ مقام کے باشندوں پر کسی شرارت کے باعث — جس کے خاطی معلوم نہ ہوں — رقمی ہرجانے لگائے جائیں۔ مالدار شہروں سے اس طرح روپیہ اینٹھنے کا اچھا موقع ہوتا ہے۔

بحری جنگ کا مال غنیمت

ف ۱۱۲ خشکی کی طرح تری میں بھی سرکاری اور خانگی جائداد میں فرق کی ضرورت ہے۔ حالت امن و صلح میں کسی جہاز کے جھنڈے، کاغذات رجسٹری یا خود افسر کا بیان کافی شہادت سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن جنگ میں چونکہ حفاظت یا

دیگر اغراض کے لئے عموماً عارضی طور پر جھنڈے غلط اڑائے جاتے ہیں۔ اسلئے تلاش اور تحقیقات کا حق غنیم کے جنگی جہازوں کو حاصل رہتا ہے۔

ف ۱۱۳ غنیم کے سرکاری جہازوں پر سوائے غیر جانبدار پانیوں کے، ہر جگہ حملہ یا قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ گو اس عام اجازت سے بعض جہاز مستثنیٰ ہیں چنانچہ

۱۔ مریض بردار جہازوں کو تباہ نہیں کیا جا سکتا گو انہیں گرفتار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

۲۔ جو جہاز خالص مذہبی، علمی یا بہبودئ بنی نوع انسانی کے اغراض کے لئے مستعمل ہوں اور کسی جنگ میں اپنے ملک کی طرف سے کچھ بھی حصہ نہ لیں تو معاہدہ ہیگ ۱۹۰۷ء کے تحت غنیم بھی ان سے تعرض نہیں کرے گا۔ پچھلی صدیوں میں پرتگالیوں وغیرہ قوموں نے ہندوستانی خاص کر بمبئی کے حاجیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا تھا، اس کے ذکر سے قلم تھراتا ہے۔[۱]

۳۔ جو جہاز حربی مملکتیں جنگی قیدیوں کے تبادلے کے لئے بنتی ہیں، وہ بھی ان فرائض کی انجام دہی کے دوران میں، غنیم کی دستبرد سے باہمی اغراض کے باعث محفوظ رہتے ہیں۔ اور تبادلہ شدہ قیدیوں کو ان کے ملک کی کسی بندرگاہ کو پہنچنے تک امان حاصل رہتا ہے، بشرطیکہ یہ جہاز اثنائے سفر آمد یا واپسی میں نہ تو کوئی مخاصمانہ حرکت غنیم کے ساتھ کرے اور نہ اس کی تیاری ہی مثلاً اسلحہ بار کرنے کے ذریعے سے کرے۔ ایسے جہازوں میں تجارتی

---

[۱] دیکھئے تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتگالیین، مولفہ زین الدین المعبری۔

سامانِ جنگی پیام یا عام مسافروں کو لے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

۴۔ ساحل کے کنارے جو چھوٹی کشتیاں مچھلیاں پکڑنے کے لئے کام میں آتی ہیں، اگر یہ لوگ غنیم کے ساتھ مخاصمانہ برتاؤ نہ کریں تو غنیم بھی ان کو نہیں ستاتا ہے۔ البتہ جو جہاز گہرے سمندر میں مچھلیوں کے شکار کے لئے کام میں آتے ہیں وہ ہیگ کانفرنس کی اس رعایت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

۵۔ بعض وقت کوئی حربی ملک خود اپنی ضرورتوں کے لئے غنیم کے ملک کے کسی جہاز کو تجارت یا دوسرا کوئی خاص مقررہ کاروبار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اجازت یافتہ جہاز بھی جب تک اپنے فرائض اور شرائط کی خلاف ورزی نہ کریں امن میں رہتے ہیں۔

دفعہ ۱۱۲ تین اور قسم کے تجارتی جہاز خصوصی تذکرے کے مستحق ہیں:۔

الف کسی غیر ملک کے جہاز جو حالت امن میں آئیں لیکن اس اثنا میں ان کے ملک سے جنگ چھڑ جائے۔

ب۔ اعلان جنگ کے بعد کسی ملک کا جہاز جو جنگ چھڑنے سے ناواقف ہو غنیم کی بندرگاہ میں پہنچے۔

ج۔ جنگ سے ناواقف جہاز کھلے سمندر میں پائے جائیں۔

ایسے جہاز اب ضبط تو نہیں کئے جاتے لیکن دوران جنگ میں یا تو ان کو روک رکھا جاتا ہے یا حربی کام میں لائے جا سکتے ہیں نیز ضرورت ہو تو اسے ہرجانہ دے کر اور اہل جہاز کی جان بچا کر اسے تباہ بھی کر دیا جا سکتا ہے۔ اب لاسلکی کے عام ہو جانے سے ایسے جہازوں کو جنگ کی فوراً اطلاع ہو گی

ہے لیکن تجارتی جہازوں کو اثنائے سفر میں ایسی اطلاع کچھ زیادہ سود مند نہیں ہو سکتی اگر حریف جنگی جہازوں سے مڈبھیڑ ہو جائے۔ معاوضہ دینے کا جو ذکر کیا گیا اس کا فوری ہونا ضروری نہیں ہے۔

ف ۱۱۵ اگر کوئی خانگی تجارتی جہاز جنگی جہاز بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ ضبط کر لیا جا سکتا ہے۔

ف ۱۱۶ غنیم ملک کی بحری تجارت کے متعلق یہ قاعدہ ہے کہ غنیم کا مال غنیم کے جہاز میں قابل ضبطی ہے۔ غنیم کا مال غیر جانبدار جہازوں میں بھی ضبط کر لیا جاتا تھا گو جہاز رہا کر دیا جاتا تھا جیسے کہ قنسولاتو دل مارے کا حکم تھا لیکن اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اسے ناجائز سمجھا جائے۔

ف ۱۱۷ غنیم کے ملک کو جانے والی ڈاک کی تلاشی اور کھول کر نگرانی رکھی جا سکتی ہے لیکن بے ضرر ڈاک کو ضبط نہیں کرتے بلکہ جہاں تک جلد ممکن ہو منزل مقصود کو بھیج دیتے ہیں تاکہ غیر جانبدار ملکوں کو زحمت نہ ہو۔

ف ۱۱۸ غنیم سے جہاز واپس لینے کے لئے فدیہ کا رواج ہے لیکن [illegible] کہ فدیہ کا معاہدہ عمل میں آنے لیکن وفا ہونے سے پہلے اگر وہ جہاز غنیم کے قبضے سے چھن جائے تو معاہدہ باطل اور کالعدم ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ سوال باقی ہے کہ اگر کوئی حربی غنیمت [illegible] جائے اور دشمن سے دوبارہ واپس لے لی گیا تو وہ اصل مالک کو دی جائے گی یا وہ مال غنیمت سمجھی جائے گی۔ اس بارے میں بڑا اختلاف [illegible] عموماً اگر گرفتاری کے بعد بہت جلد بازیابی ہو تو اصل مالک کا حق مرجح سمجھا

جاتا ہے۔ اس بارے میں اصلاحی قانون یہ رہا ہے کہ مال کی بازیابی پر رعایا سے ان کا مال پہنچوایا جاتا ہے پھر بقیہ کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ تقسیم کے بعد حقوق سابقہ کے دعوے صرف اس حد تک سنے جاتے ہیں کہ غنیمت یاب سپاہی کو اصل مالک سے لاگت لے کر مال دینے پر مجبور کیا جائیگا اور یہ قاعدہ بری اور بحری دونوں صورتوں کے لئے ہے۔ انگریزی قانون یہ ہے کہ بازیافتہ جہاز کا مالک ⅛ سے ¼ مالیت تک، بلحاظ خطرہ فوج کو معاوضہ اور انعام کارگزاری دیتا ہے۔

تلاشی اور تجویز ضبطی

۱۱۹۔ کسی جنگ میں ہر دو فریق نہ صرف ایک دوسرے کے خلاف تباہی اور ضبطی وغیرہ کا حق رکھتے ہیں بلکہ غیر جانبدار مملکتوں پر بھی بہت سی پابندیاں عائد کر سکتے ہیں مثلاً زیر محاصرہ مقام پر اپنے جہاز نہ بھیجنا، فریق ثانی کو جنگی سامان مہیا نہ کرنا وغیرہ۔ غیر جانبدار جہاز پر سامان کا کچھ حصہ یا سب کسی حربی کا ہو سکتا ہے۔ اور کسی حربی جہاز پر کسی غیر جانبدار کا مال ہو سکتا ہے۔ لالچ انسان کو ایسے موقعوں پر جھوٹ اور دھوکے پر آمادہ کر سکتا ہے اگر ظاہر پر اعتماد کر لیں تو ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ اور اعتماد کرنا چھوڑ دیں تو بین الممالک پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ غیر جانبدار پانیوں میں گرفتاری بھی ممنوع ہوتی ہے انھیں وجوہات سے ہر فریق جنگ اپنی یا اپنے حلیف و شریک جنگ کی یا جنگ میں مسخر شدہ بندرگاہوں میں عدالت غنائم بحری

قائم کرتا ہے اور کسی حربی کا مال ہو یا کسی غیر جانبدار کا سمندر میں ملے یا بحری فوج نے خشکی پر گرفتار کیا ہو ضبطی سے پہلے ایسی کسی عدالت کے روبرو پیش کیا جاتا ہے جہاں ضبط کنندوں کے حقوق کی قانون بین الممالک کے مطابق جانچ کی جاتی ہے۔ برطانیہ میں ضبط شدہ مال کی پوری قیمت متعلقہ افسروں اور سپاہیوں میں بانٹ دی جاتی ہے۔ کوئی ملک خاص حکم کے ذریعے اپنی عدالت غنائم بحری کو کسی قاعدے کا پابند کرا سکتا اور مروّجہ قانون بین الممالک کو نظر انداز کرنے کا حکم دے سکتا ہے لیکن بین الممالک ذمہ داری حکومت پر ہوگی، عدالت پر نہیں۔ ایک بین الممالک عدالت قائم کرنے کی کئی بار کوشش ہوئی لیکن اب تک جامۂ عمل نہیں پہنایا جا سکا ہے۔

ف ۱۳۰ ہر حربی کے جنگی جہازوں اور جنگی طیاروں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ تنہا یا خشکی کی فوج کی مدد سے فریق ثانی کے نیز غیر جانبداروں کے تجارتی جہازوں کو روک کر تلاشی لیں۔ شبہات پیدا نہ ہوں تو غیر جانبدار جہازوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ورنہ بزور ان کو اپنی کسی بندرگاہ میں لاکر مفصل تلاشی اور تحقیقات کی جاتی ہے۔ تلاشی میں سب سے پہلے کاغذات جہاز دیکھے جاتے ہیں جن میں مالک جہاز، اس کا وطن، راہ سفر، منزل مقصود، نوعیت بار (اسباب)، مالک اسباب، ملاحوں کی فہرست، معاہدہ باکرائے کی تفصیل مندرج ہوتی ہے۔ ان کاغذات کے نہ ہونے، تلف کردیئے جانے یا جعل کے عمل میں لائے جانے کا خمیازہ عدالت غنائم بحری کے حکم سے ایسے جہاز کو بھگتنا پڑے گا۔ حالت اضطرار میں ایسے جہاز کو

تباہ کر دیا اور ڈبو دیا جا سکتا ہے، خواہ وہ غیر جانبدار ہی کا کیوں نہ ہو۔ لیکن کاغذات جہاز اور ملاحوں کی سلامتی کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ اور پھر ان کاغذوں وغیرہ کی مدد سے مقدمہ چلایا جائے۔ اگر اتلاف خلاف قانون اور بے وجہ ہوا ہو تو متضرر کو ہرجہ دلایا جائیگا۔

کسی حربی کے جنگی جہاز بغیر جھنڈا لگائے یا غلط جھنڈا لگائے ہوئے بھی سفر کر سکتے اور غنیم کا پیچھا کر سکتے ہیں لیکن مقابلہ یا تلاشی کے وقت ان کو اپنا جھنڈا اڑانے کی پابندی ہوتی ہے۔ تلاشی کا یہ حق صرف فریق جنگ کو حاصل ہوتا ہے جس میں باغی بھی داخل ہیں۔ غیر جانبدار جنگی جہازوں کی البتہ تلاشی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہتک سمجھی جاتی ہے حالت امن میں صرف بحری لٹیروں اور بردہ فروشوں کے جہازوں کی تلاشی ہو سکتی ہے کسی ملک کے عام جہازوں کی کوئی تلاشی نہیں لی جا سکتی۔

(۱۳۱) کسی حربی کا تجارتی جہاز فریق مخالف کے جنگی جہاز کا مقابلہ کر کے بچ نکل سکتا ہے مگر جوکھم اس کا اپنا ہے۔ غیر جانبدار جہاز اگر مقابلہ کرے تو ضبط کر لیا جا سکتا ہے۔ مقابلے میں اگر وہ بچ بھی نکلے تو اس کے ملک اور تلاشی لینے والے ملک میں جھگڑا پیدا ہوگا۔ غیر جانبدار ممالک کا اپنے جہازوں کو خط اطمینان دے دینا یا خود فریق جنگ کے شہبندروں (قونصلوں) سے معاینہ کرا کے صداقتنامہ لینا کچھ زیادہ کارآمد ثابت ہوا ہے کیونکہ بندرگاہ سے نکلنے کے بعد ان پر ممنوعہ اشخاص اور اشیاء

بار ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ زیر نگرانی بارہ کرانے کے بعد کسی حربی کا ناظر جہاز پر لیجانے کے ذریعہ ان دقتوں کا ازالہ ہو سکے اور ایسے ناظر کو ضنار ے کی طرح امان عطا کیا جائے۔

سپاہی ہتھیار اور طریقہ جنگ

۱۲۲ کسی مہذب حربی پر سپاہیوں، ہتھیار اور طریقہ جنگ کے انتخاب میں بھی کافی پابندیاں ہوتی ہیں۔

۱۲۳ کوئی ملک اپنی رعایا کو تو باقاعدہ فوج میں بھرتی کرتا ہے لیکن بعض وقت غیر جانبدار ملک سے بھی خانگی بھرتی ہوتی ہے جو ہموطن غنیم کی فوج کے ہاتھ پڑ جائیں ان کو سخت اور خطرناک سزا دیجا سکتی ہے۔ غیر جانبدار ملک کے رضاکاروں کو کوئی خصوصی سخت سزا نہیں دیجائیگی لیکن ان کے ملک کی حکومت سے شکایت کی جا سکے گی۔

بے قاعدہ فوج کی اجازت چار شرطوں سے دیجاتی ہے۔

ا۔ ان پر کوئی ذمہ دار افسر مقرر رہے۔

۲۔ وردی کی تو ضرورت نہیں لیکن وہ کوئی فوجی یکساں نشان ہمیشہ اس طرح لگائے رہیں کہ کافی فاصلے سے نمایاں رہے۔

۳۔ ہتھیار علانیہ لئے رہیں۔

۴۔ قانون جنگ کی پابندی کریں۔

۱۲۴ بے قاعدہ فوج کو فوج عوام سے امتیاز کرنا چاہئے۔ جذبات

وطن پروری سے بعض وقت دشمن کے مقابلے کے لئے پوری رعایا اُٹھ کھڑی ہوتی یا اٹھنے پر مجبور کی جاتی ہے۔ اُسے "عام اٹھان" (لیے وی آں ماس" یا حشر) کہتے ہیں۔ جبری اور عام فوجی تعلیم کے باعث اس کی اہمیت اب اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی ڈاکوؤں کی ٹولی نہیں بلکہ باضابطہ غنیم سمجھا جاتا ہے بشرطیکہ وہ ہتھیار علانیہ رکھیں اور قوانین جنگ کا پورا لحاظ کیا کریں۔

و۱۲۵ وحشی اور غیر منضبط سپاہیوں سے مدد لینے کو مہذب ممالک میں پسند نہیں کیا جاتا، کم از کم یہ خواہش کی جاتی ہے کہ دوسرے اس سے استفادہ نہ کریں، ورنہ عمل یہی ہے کہ گوروں کی جنگوں میں آتش باری کے وقت کالی اور رنگدار فوج سب سے آگے رکھی جاتی ہے اور کسی جگہ فاتحانہ داخل ہوتے وقت سب سے پیچھے۔ یوں بھی لارنس (ص ۴۹۸) وغیرہ کو اعتراف ہے کہ انتہائی مہذب فوجیں بھی "کبھی کبھی وحشت اور بربریت دکھانے لگتی ہیں — خاص کر "غیر مہذب" دشمن کے مقابل۔

جاسوس

و۱۲۶ جاسوس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جب ایک حربی دشمن کی خبر لانے کے لئے جان پر کھیل کر اور بھیس بدل کر جاتا ہے۔ دوسرے وہ جب کوئی شخص غداری کر کے اپنے ملک کے حالات و واقعات

غنیم کو مطلع کر دیتا ہے۔ غدار کو بے شبہ عبرتناک سزا دی جا سکتی ہے لیکن دشمن کے جاسوس کو ــــ اگرچہ معمولی حربی کے مقابل سخت برتاؤ کیا جاتا ہے ــــ روز افزوں نرمی کا مستحق سمجھا جانے لگا ہے۔

ہیگ کانفرنس میں طے ہوا ہے کہ کسی شخص کو جاسوسی کے الزام میں سزا دینے سے پہلے تحقیقات ضروری ہے۔ نیز کوئی شخص جاسوسی کر کے بچ نکلے اور اپنی فوج میں جا ملے تو آئندہ گرفتار ہونے پر اسے اس سابقہ جاسوسی کی بنا پر سزا نہ دی جائے۔ باوردی دشمن کو جاسوس نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی ان لوگوں کو جن کا کام ہی پیغام رسانی ہو اور وہ اس کام کو علانیہ انجام دیتے ہوں یا مثلاً غباروں میں بیٹھ کر جاتے ہوں۔

ف ۱۲۷ جنگی قیدیوں کو قتل نہیں کیا جاتا لیکن جاسوسی پر سزائے موت دی جاتی ہے۔ اگرچہ ہیگ کانفرنس کی رائے میں جاسوسی صرف اس وقت ہوتی ہے جب غنیم کے رقبۂ کارزار میں ناجائز طور سے خبر پیا حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ حالانکہ معرکۂ کارزار سے دور غنیم کے مثلاً پائے تخت میں بھی جاسوسی کی جا سکتی ہے۔ غنیم کے لاسلکی پیامو کو بیچ میں اچک لینا غالباً جاسوسی نہیں سمجھی جائے گی۔ اور کسی نامہ نگار صحافت کا کسی غیر جانبدار جہاز پر سے پیام بھیجنا بھی اب جاسوسی نہیں سمجھا جاتا۔

خانگی افراد کو لوٹ مار کی اجازت

۱۲۸ - قدیم زمانے میں کوئی حربی حکومت اپنی نیز غیر جانبدار ملک کی رعایا کو اس بات کی تحریری اجازت دیتی تھی کہ موقع ملے تو غنیم کے تجارتی جہاز لوٹ لے اٹھارویں صدی میں غیر جانبدار سے مدد لینے کی ممانعت ہوئی۔ اور ۱۸۵۶ء میں اعلان پارلیس کے ذریعے خود اپنی رعایا کو بھی اس خانگی بحری جنگ سے روک دیا گیا ہے۔

رضاکار بیڑہ

۱۲۹ - خانگی افراد کی بحری قزاقی میں اور رضاکار بیڑے میں فرق ہے۔ اگر کسی ملک کے خانگی جہازوں کے مالک مفت یا کسی معاوضے پر اپنے جہاز کسی جنگ میں اپنی حکومت کے سپرد یا اس کی نگرانی میں دیدیں یا ان کو تنخواہ پر دیا اور لوٹ مار میں حصہ دینے کا وعدہ کیا جائے مگر جہاز پر سرکاری بحری فوج یا افسر رہیں تو اس میں کوئی حرج سمجھا نہیں جا سکتا۔

۱۳۰ - خانگی یا سرکاری تجارتی جہازوں کو حسب ضرورت جنگی جہازوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جس کے لئے سرکاری بیڑے میں شامل کرنا، اس کے افسروں کا سرکاری بحریے سے تعلق رکھنا اور اس پر بحریے کا جھنڈا اڑانا اور ضروری اعلان کافی ہے اور ان کا بحری جنگ کے قواعد کا لحاظ رکھنا ضروری ہے لیکن روسی جاپانی جنگ میں بعض روسی رضاکار -

جہاز بوسفورس اور ذردانیل سے اپنے کو تجارتی بتا کر گزر گئے جب معاہدہ ترکی پانیوں سے جنگی جہازوں کو گزرنے کی ممانعت تھی۔ اور آگے جاکر بحر قلزم میں انھوں نے اپنے جنگی ہونے کا اعلان کیا۔ جب سے یہ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ تجارتی جہاز کو جنگی جہاز کہاں بنایا جا سکتا ہے؟ حریف کا اپنی مملوکہ یا مسخر شدہ بندرگاہوں یا ساحلی پانیوں میں ایسا کرنا تو ظاہر ہے کہ کسی اعتراض کے قابل نہیں لیکن بعض ممالک کو اپنی آزادی پر اصرار ہے کہ وہ جہاں چاہیں یہاں تک کہ غیر جانبدار پانیوں میں بھی، ایسا کر سکتے ہیں۔ جن ملکوں کی بندرگاہیں دنیا کے ہر حصے میں ہیں ان کا مفاد اور ان ملکوں کا مفاد جن کو یہ سہولت نہیں ہے، کیسے ہم آہنگ ہو سکتا ہے؟ اس حد تک البتہ سب متفق ہیں کہ غنیم سے تجارتی جہاز چھین کر جب کوئی جنگی جہاز اس مال غنیمت پر اپنے افسروں کو بھیج کر اسے بھی جنگی جہاز قرار دے دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اس کو بھی شاید سب مان لیں گے کہ ایک بار جنگی قرار دینے کے بعد اسی جنگ کے دوران میں ایسے جہاز کو دوبارہ غیر جنگی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آبدوز سرنگ

ف ۱۳۱۔ جہازوں کو بھک سے اڑنے والے مادوں کی مدد سے تباہ کرنے کا ایک موثر ذریعہ آبدوز سرنگ بھی ہے۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اگر وہ صرف دشمن کے جہاز کے لئے رکھی جائے یا اس کی

تھا" کو بھول کر کیا ہے" کو دیکھنے لگتی ہے۔ اگر دشمن اپنے واجبات کو ملحوظ رکھ کر اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دے تو چشم ما روشن دل ما شاد، لیکن جنگ جب تک مہذب قوموں میں بھی ہوا کرے گی، انھیں اس کے نتائج کو گوارا کرنا پڑے گا۔ اپنی طرف سے تعدی نہ کرو لیکن دوسرے کی تعدی کے لئے تیار رہو تو اسی میں سلامتی ہے ورنہ جب چڑیاں چگ گئیں تب پچھتائے کیا ہوت۔

ایک بات البتہ دیکھنے میں آ رہی ہے جو کافی اہم بھی ہے۔ وہ یہ کہ معاہدات اور دیگر واجبات کی عمداً خلاف ورزی پر مہذب تر ممالک میں گھمنڈ کم ہوتا جا رہا ہے اور یا تو تاویل کی جاتی ہے یا پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اخباروں کا بیان تھا کہ حالیہ حبشی جنگ میں صلیب احمر میں کام کرنے والے رضا کار اور غیر جانب دار ڈاکٹروں سے اطالوی افسر یہ لکھانے کی کوشش کرتے رہے کہ ان کے پاس گاس زدہ مریض نہیں آئے۔ اس واقعے کے سوائے اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ غیر ممالک میں بدنامی اور فضیحت کا ڈر بڑھ رہا ہے۔ صحافت وغیرہ سے بین الاقوامی ذہنی اور علمی تعلقات جتنے بڑھتے جائیں گے، معاہدوں اور اقراروں کی تعمیل کی اس موثر تہدید کو قوت حاصل ہوتی جائے گی۔

جنگ میں ہتیار روک تاؤ

ف ۱۳۵ حربیوں میں بے روک ٹوک اور مسلسل خونریزی ہی نہیں ہوتی۔

بعض وقت ان کو ہتھیار روک کر معاملت کرنی پڑتی ہے یہ محدود بھی ہوتا
ہے غیر محدود بھی، عارضی بھی، مستقل بھی۔ اس کے قواعد کے لئے جو معاہدے
ہوں وہ انگریزی میں کارٹل کہلاتے ہیں۔ مثلاً فریقین جنگ کے نمائندے
حریف کے ملک میں دوران جنگ میں رہ کر قیدیوں کے تبادلے کا انتظام
کر سکتے ہیں نیز جہازوں وغیرہ میں ان کو لا اور لیجا سکتے ہیں۔ ایسے کارٹل
جہاز کو واپسی میں اپنے مامن کو پہنچنے تک چھیڑا نہیں جا سکتا۔ غنیم کی کسی رعیت
امن و امان سے رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ لڑتے لڑتے دشمن
ہتیار ڈالدے تو خونریزی بند کرکے اس کو امان دینا پڑتا ہے۔ اس سلسلے
ں بری جنگ ہو یا بحری، سفید جھنڈا بلند کیا جاتا ہے جس کے معنے اطاعت
پر آمادگی یا کم از کم گفتگو پر آمادگی ہوتی ہے۔ اس طرح کا جھنڈا صرف افسر
فوج کے حکم سے بلند کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی سپاہی خود سفید جھنڈا دکھائے
خود اس کے ساتھی اس پر آگ برسا سکتے ہیں۔ لارنس کا بیان ہے کہ
گفت وشنید کی درخواست کو نامنظور کیا جا سکتا ہے جس کی اطلاع سفید
جھنڈے پر دور ہی سے آگ برسا کر دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ گفت وشنید
کے لئے آئی ہوئی جماعت امان میں رہتی ہے بجز اس کے کہ وہ جاسوسی کرے
جس کی سزا موت ہے ضرورت ہو تو ان کی آنکھوں پر پٹی باندھی جا سکتی ہے
یا عارضی طور سے ان کو واپسی سے روک رکھا جا سکتا ہے۔ اگر گفت وشنید
ناکام رہے تو بھی ان پیام رسانوں کو واپس اپنے مامن یا اپنی فوج کو پہنچنے
تک امان حاصل رہتا ہے۔ اگر اطاعت مشروط ہو تو اس کی پوری تعمیل

فریقین پر واجب ہوتی ہے جس معاہدے کی شرائط کی منظوری مرکزی حکومت کی اختیاری ہوتی ہے۔ اسے "مراوضہ" کہتے ہیں وہ تا منظوری نافذ نہیں ہوتا۔

اسی طرح ڈاک اور تاروں کے تبادلے کے لئے بھی معاہدے ہوتے ہیں جس میں باہمی فائدہ ہے۔

۱۶۳۔ غنیم کی رعایا کو کئی قسم کے امان دئیے جاتے ہیں۔

۱۔ پاسپورٹ (عام اجازت سفر) جو حکومت کی طرف سے عموماً اپنے پورے علاقے کے لئے ہوتا ہے جس میں فوجی قبضے میں آیا ہوا ملک بھی شامل ہے۔

۲۔ خاص اجازت سفر جو حکومت کی طرف سے یا بری یا بحری فوجی افسر کی طرف سے کسی شخص یا چیز یا دونوں کے لئے صرف کسی خاص مدت کے لئے اور کسی خاص غرض کے لئے اور کسی خاص مقام کو جانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ایسے اجازت نامے خاص صورتوں میں منسوخ بھی کر دئے جا سکتے ہیں مگر اس صورت میں اجازت یافتہ کو اپنے امن تک واپس جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ شرائط اجازت کی خلاف ورزی پر سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

۳۔ خفارہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی حربی افسر اپنے کسی جوان یا جماعت کو کسی غنیم شخص یا چیز کے ساتھ رہنے یا جانے کے لئے متعین کر دیتا ہے تاکہ خفارہ زدہ کو ہماری فوج نادانستہ ضرر نہ پہنچائے۔ اگر یہ لوگ غنیم میں گھر جائیں تو خفارہ یاب کو توقع رہے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ خفیروں کو بھی قدیم رواج ہے کہ بے روک ٹوک اپنے امن یا اپنی فوج کو واپس جانے کی اجاز

دی جاتی ہے۔

۴۔ امان نامہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی افسر کسی غنیم کو تحریر لکھ دے کہ اسے کوئی نہ ستائے۔ امان دہندہ کے ماتحت ہیں اس امان نامے کا لحاظ کیا جائے گا۔

۵۔ اجازت نامہ تجارت بھی کسی غنیم شخص کو دیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ اجازت دہندہ کی عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ ایسی اجازتیں عام بھی ہوتی ہیں، خاص بھی اور محدود زمانے کے لئے بھی۔ کوئی یلغار کرنے والی فوج کسی مقام کے باشندوں کو مایحتاج بیچنے کا حکم دے تو اس کے بھی یہی معنے ہوتے ہیں کہ وہ انہیں تجارت کی خاص اور محدود اجازت دیتی ہے۔ مثلاً خندقوں اور قلعوں کی جنگ خاص کر طویل عرصے تک ایک ہی مقام پر موقوف رہتی ہے تو مردوں کو دفن کرنے یا کسی اور مماثل غرض کے لئے محدود مقام پر اور محدود عرصے کے لئے فریقین جنگ بند کر دیتے ہیں، اگر ان حدود کے باہر فریقین میں جنگ جاری رہتی ہے اور معینہ مدت گزرنے پر خود بخود یہ محدود مصالحت ختم ہو جاتی ہے اسے عربی میں "ہدنہ" کہتے ہیں۔ انگریزی میں کوئی معین اصطلاح نہیں ہے۔ ہر فریق اطلاع دے کر پھر شروع کر سکتا ہے۔ اور اگر فریق ثانی شرائط کی خلاف ورزی کرے تو بلا مزید اطلاع بھی جنگ شروع کر سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ غیر ذمہ دار افراد کی خلاف ورزی کا الزام سب پر نہیں ڈالنا چاہیئے۔

اس کے برخلاف جب کوئی قلعہ یا شہر اطاعت قبول کرنے کے لئے گفت و شنید کرنی چاہے یا فریقین جنگ صلح کے شرائط طے کرنے چاہیں تو اکثر

عارضی طور سے جنگ رک جاتی ہے اور شرائط طے ہوں تو صلح ورنہ جنگ دوبارہ شروع ہو جاتی ہے اس توقف کو فرانسیسی میں آرمسٹس کہتے ہیں گو انگریزی میں یہ لفظ مذکورۂ بالا قسم اور قسم ہاذا دونوں صورتوں کے لئے برتا جاتا ہے۔ —

یہ تقسیم لارنس کی ہے لیکن ہمارے خیال میں مصالحت کی چار ایک دوسرے سے ممتاز صورتیں ہوتی ہیں :—
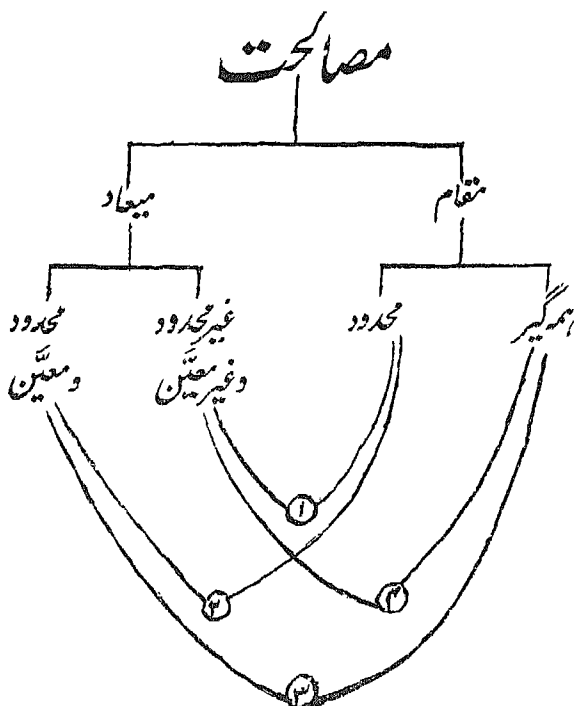
پہلی صورت محاذ جنگ پر عموماً پیش آجاتی ہے ہر فریق اطلاع دے کر اسے ختم کر سکتا ہے۔ اسے دکھنی زبان میں امبال کہتے ہیں۔

دوسری صورت عموماً میدان جنگ یا محاذ پر اس لیے ہوتی ہے کہ کوئی گفت و شنید کریں یا کوئی مشترکہ مفاد مثلاً مُردوں کی تدفین وغیرہ عمل میں لائی جائے۔

تیسری صورت وہ عارضی صلح ہے جس میں قطعی صلحنامے کے شرائط طے ہوتے ہیں۔

چوتھی صورت جنگ کو قطعی طور سے ختم کرتی ہے۔ ایسی مصالحتوں میں اب عموماً "ہمیشہ" کا لفظ لکھ دیا جاتا ہے۔

صلح اور صلح جوئی

ف ۱۳۸ قدیم زمانے میں شکست کے باوجود اگر کسی ملک کا حکمران محفوظ رہے اور اُس کے قبضے میں کچھ علاقہ ہو اور فاتح پیش قدمی کرکے مفتوح کا پورا علاقہ چھین لینا پسند نہ کرے تو جنگ بغیر کسی صلحنامے کے ختم ہو جاتی تا آنکہ مفتوح میں پھر مقابلے کی قوت نہ آ جائے۔ اس کی جدید ترین مثال سنہ ۱۸۶۷ء میں ملتی ہے جب فرانس نے مکسیکو سے چپ چاپ اپنی فوجیں واپس بلا لی تھیں۔

ف ۱۳۹ اسی طرح اگر کوئی فریق جنگ اپنے غنیم کے پورے علاقے پر قبضہ کرکے الحاق کرلے تو بھی کوئی صلحنامہ نہیں لکھا جاتا۔ اس کی ایک استثنائی مثال سنہ ۱۹۰۲ء میں جنوبی افریقا کی بوئروں کی جنگ ہے، جب انگریزوں

نے بوئر حکومت سے تو نہیں البتہ مشہور اور با اثر بوئر رہنماؤں سے سمجھوتے پر دستخط لیئے تھے۔

۱۴۰ف جب جنگ ختم ہونے پر ہر دو حربی مملکتوں کا وجود برقرار رہے تو ان میں صلحنامہ مرتب ہوتا ہے پہلے ایک ابتدائی راضی نامہ تیار ہو کر دستخط ہوتے ہیں جس کے ساتھ خونریزی رک جاتی ہے لیکن اگر محاذ وسیع ہو تو تب رکے گی جب اطلاع ملے۔ یاد رہے کہ ہر فوج صرف اپنی حکومت کی اطلاع کی پابند ہوگی۔ ابتدائی راضی نامے کے بعد قطعی صلحنامہ لکھا جاتا ہے۔ جس میں نزاعی مسائل کے حل پر دونوں فریق رضامندی ظاہر کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں ایک عجیب صورت حال پیش آئی تھی کہ انگریز وں اور ممالک متحدہ امریکا میں جنگ تو رک گئی لیکن قطعی صلحنامے کے شرائط پر فریقین متفق نہ ہو سکے۔ مجبوراً صلحنامہ تیار ہی نہیں کیا گیا مگر جنگ دوبارہ نہیں چھڑی۔

۱۴۱ف جب قطعی صلح ہو جاتی ہے تو :-

۱۔ امر نزاعی کا تصفیہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ حقوق حربیت (قتل، قید، اتلاف، قبضہ، مطالبات باجناج ورقم، جرمانہ اور ان آخرالذکر تین چیزوں کا اور طلب بقایا وغیرہ) ختم ہو جاتے ہیں۔ اور جنگی قیدیوں کو جلد سے جلد ہر فریق رہا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ "بقاء ما کان علی ما کان"۔ اس لیئے

معاہدہ صلح میں جب تک اس کے خلاف تصریح نہ ہو یہی سمجھا جائے گا کہ ابتدائی راضی نامے کے وقت جو فریق جس چیز اور جس جگہ پر قابض تھا وہ بعد مصالحت بھی اسی کے پاس رہیگی۔

۴۔ خانگی حقوق اور وہ معاہدے جن کی تجدید اور احیا کی ضرورت نہیں اور جو دوران جنگ میں معطل ہو گئے تھے دوبارہ کارگر ہو جاتے ہیں۔

اجزائے صلحنامہ صلحنامے کی دستاویز میں کچھ تو عام چیزوں کا ذکر ہوتا ہے: لڑائی بھڑائی کا ختم ہو کر امن و صلح کا قائم ہونا اور جنگ کے پیدا کردہ امور کی یکسوئی، اور کچھ خاص چیزیں ہوتی ہیں یعنی جس موضوع پر لڑائی چھڑی تھی اس کے متعلق راضی نامہ اور بقاء ما کان علی ما کان منظور نہ ہو تو نئے انتظام کی تفصیل۔ تیسرے متفرق امور ہوتے ہیں جو عام یا خاص اجزائے صلح سے کچھ تعلق رکھتے ہوں۔ چوتھے اقرار پابندی و تعمیل اور فریقین کے نمائندگان مجاز کے دستخط اور تاریخ۔

دفعہ ۱۴۲ اصل معاہدے کے علاوہ ضمیمے اور بعض وقت خفیہ ناقابل تشہیر دفعات بھی ہوتے ہیں جو فوراً یا رفتہ رفتہ طے اور نافذ ہوتے ہیں۔ صلحنامے پر دستخط ہونے کے بعد فریقین کی مرکزی حکومت ان کی توثیق کرتی اور توثیق شدہ دستاویزوں کا تبادلہ عمل میں آتا ہے۔ اثنائے نفاذ میں الفاظ کے مطلب اور مراد پر فریقین میں اختلاف ہو تو پھر تعبیر معاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے لئے بعض وقت

کسی ثالث کو حکم بھی بنایا جاتا ہے جو بعد تحقیقات فیصلہ کرتا ہے۔ مجلس اقوام اور ہیگ کی "مستقل عدالت بین الممالک" سے بھی رجوع کیا جاتا ہے (جو جنگ عظیم سے پہلے کی "مستقل عدالت تحکیم" [ہیگ سنہ ۱۹۰۲ء تا سنہ ۱۹۱۴ء] کی جانشین ہے) اور بعض وقت اگر فریقین راضی ہوں تو ترمیم بھی عمل میں آتی ہے۔ قدیم زمانے میں نفاذ کی ضمانت کے لئے "رہین" یا یرغمال بھی لئے جاتے تھے

غیر جانبداری

تعریف ۱۴۳۔ غیر جانبداری کے معنے یہ ہیں کہ کسی جاری جنگ میں کوئی مملکت حصہ نہ لے اور ہر دو فریقین جنگ سے مسالمانہ تعلقات برقرار رکھے۔

تاریخ ۱۴۴۔ دو کے جھگڑے میں تیسرے کا الگ تھلگ اور ناطرفدار رہنا قریب قریب اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ دو سے زیادہ خود مختار ملکوں کا بہ یک وقت دنیا میں پایا جانا۔ اگرچہ ہندو اور رومی مقنن بھی اس کا ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ اس کا تصوّر بطور ایک واقعے کے کرتے ہیں، غیر جانبداروں کے حقوق وفرائض کا بیان اُن کے ہاں نہیں ملتا۔ مسلمانوں میں عہد نبوی کے متعدد معاہدے صراحت سے

اسی غرض سے ہوے تھے۔ اسی عہد کے تاریخی واقعات، اور قرآن اور بعد میں فقہ کے احکام میں بھی اس کا خاص ذکر ملتا ہے۔ اور عرب جنگ میں غیر جانبدار رہنے والے کو مُعتزل اور غیر جانبداری کو اعتزال کہتے رہے ہیں۔ (غیر جانب داری اسلامی قانون بین الممالک میں" کے عنوان سے میرا جو جرمن مضمون رسالہ زیڈ ڈی ام جی ۱۹۳۵ء جلد ۸۹ صفحہ ۶ تا ۸۰ میں چھپا ہے اس میں اس کی تفصیل ملیگی)

یوروپ میں غیر جانب داری کا قانونی تصوّر تین سو سال سے زیادہ پرانا نہیں اور ابتدا میں یہ تصوّر بہت مدھم اور دھندلا تھا چنانچہ گروشیوس کی رائے ہے کہ کسی جنگ میں غیر جانب دار کو چاہیئے کہ مظلوم کے ساتھ رعایت ملحوظ رکھے اور ظالم کے ساتھ رکھائی بلکہ سختی برتے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک حربی کا اپنے غنیم سے کسی غیر جانب دار کو تجارتی تعلقات باقی رکھنے میں رکاوٹیں ڈالنا ــــــ جس کا قدیم یونانی اور رومی تاریخ میں بھی کہیں کہیں پتہ چلتا ہے ــــــ کس حد تک قانونی اہمیت رکھتا تھا۔ قدیم زمانے میں غیر جانب داری کے معاہدے کے بغیر ناطرفداری کی پابندی نہیں عائد ہوتی تھی۔ لیکن اب حربیت اور غیر جانب داری کے علاوہ ایک درمیانی صورت کی اجازت نہیں دیجاتی اور کسی غیر جانب دار مملکت کو کھلم کھلا اور سرکاری طور سے کسی ایک فریق جنگ کو اخلاقی یا مادّی مدد دینے کی آزادی

نہیں ملتی۔ اور ۱۷۹۳ء میں برطانیا اور فرانس کی جنگ میں ممالک متحدہ امریکا کا طرزِ عمل ایک موثر نظیر بن گیا ہے۔

احکام | ف ۱۴۵۔ غیر جانب داری کا اُصول یہ ہے کہ غیر جانبدار کسی بھی حربی کے قطعاً ناطرفدار ہیں اور ہر حربی بھی غیر جانب دار کی خود مختاری اور اقتدارِ اعلا کا سختی سے احترام کرے۔ بہ ظاہر یہ خیال کیا جائیگا کہ کسی جنگ کے چھڑنے کے باوجود بھی غیر جانب دار کو وہی آزادیٔ عمل حاصل رہنی چاہیئے جو جنگ سے پہلے اُسے حاصل تھی، لیکن عملاً ایسا نہیں ہوتا بلکہ غیر جانب دار کو جہاں بعض حقوق سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، وہیں اُسے بعض نئے حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

غیر جانبدار بنانا | ف ۱۴۶ لیکن غیر جانب دار کے حقوق اور فرائض بیان کرنے سے پہلے غیر جانب دار ہونے اور غیر جانب دار بنادئے جانے میں فرق کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی نظیریں ملتی ہیں کہ بہت سی ہمسایہ سلطنتیں مل کر کسی مملکت کو یا اس کے کسی حِزء کو یا کسی ندی یا آبنائے کو غیر جانب دار قرار دیدیں۔ ایسے غیر جانب دار بنائے ہوئے علاقے میں نہ تو اُس کی مالک سلطنت جنگ کرسکے گی، اور نہ کسی اور مملکت کو یہ اجازت ہوگی۔ عموماً دو یا زائد قوی سلطنتیں اپنے بیچ میں ایک حاجز مملکت (بفر اسٹیٹ) کھڑی کر لیتی ہیں اور باہمی مفاد کی خاطر اس کو مستقلاً غیر جانب دار قرار دیدیتی ہیں

اور اس کے حق جنگ سے دائمی دست برداری کے معاوضے میں اس کی حفاظت کا وعدہ کرتی ہیں چنانچہ ۱۸۱۵ء میں انگلستان آسٹریا، فرانس، پروشیا، اور روس نے سوئٹزر لینڈ کو مستقلاً غیر جانب دار قرار دیا اور سوئٹزرلینڈ میں جنگجوئی نہیں رہی ہے اور چونکہ اس حالت کو برقرار رکھنے ہی میں ہمسایوں کا فائدہ ہے، اس لئے اس کی خلاف ورزی اب تک نہیں ہوئی ہے ۱۸۳۱ء میں بلجیم کو ہالینڈ سے الگ کرکے اسے یوروپ کی بڑی قوتوں نے مستقلاً غیر جانب دار بنا دیا تھا۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے فرانس کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بلجیم پر حملہ کردیا اور یوروپ کی اس بڑی جنگ کے بعد بلجیم کی مستقل غیر جانب داری کو صراحت کے ساتھ ختم کردیا گیا۔ ۱۸۶۷ء میں لگزمبورگ کو بھی ایک مستقلاً غیر جانب دار مملکت قرار دیا گیا۔ اور چونکہ کوئی مستقلاً غیر جانبدار مملکت کو مدافعت کے سوا کسی اور جنگ کی اجازت نہیں ہوتی اس لئے باوجود لگزمبورگ سے متعلق منعقد شدہ کانفرنس میں حصہ لینے کے بلجیم کو اس معاہدے میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ وہ خود مستقلاً غیر جانب دار بنا دیا گیا تھا۔ یوروپ کی بڑی جنگ کے بعد سے اس کی بھی غیر جانب داری صراحت کے ساتھ ختم کردی گئی ہے۔

ف ۱۴۷ کسی صوبے یا حصۂ مملکت کو غیر جانب دار بنانے کی بھی نظیریں ملتی ہیں۔ لیکن یہ عملاً بے سود ہیں۔ کیونکہ ایسے مستقلاً غیر جانب دار صوبے کی مالک سلطنت کو جنگ کی آزادی رہتی ہے اور وہ اس صوبے سے سپاہی اور دیگر جنگی چیزیں برابر حاصل کرتی ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ غنیم ایسے برائے نام غیر جانبدار علاقے کا کوئی احترام کرے۔

ف ۱۴۸ بعض آبی راہوں مثلاً نہر سویز کے متعلق بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا اصل باعث یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کو نہر سویز کا اپنے لئے ہمیشہ کھلا رکھنا مطلوب تھا اور نہر سویز کی مالک (ترکی) میں اتنی قوت نہ تھی کہ انگلستان وغیرہ کے مطالبے سے انکار کر سکے ۱۹۱۴ء کی بڑی جنگ کے بعد آبنائے بوسفورس اور آبنائے دردانیل بھی نہتے اور مستقلاً غیر جانب دار بنا دئے گئے تھے۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں مونٹ ریجو کانفرنس میں ترکی کے مالکانہ حقوق بڑی حد تک پھر تسلیم کرلئے گئے۔

قانون غیر جانب داری میں نہ صرف سلطنتوں کے بلکہ ان کی رعایا کے حقوق و فرائض سے بھی بحث ہوتی ہے۔ اور اس کا خلاصہ یوں واضح کیا جاسکتا ہے:-

غیر جانبدار مملکت کے حقوق

ف ۱۴۹ (۱) اگر کوئی جنگ چھڑے تو فریقین جنگ کا فریضہ ہوتا ہے کہ غیر جانب دار مملکتوں کی سرزمین میں کوئی معرکہ آرائی نہ کریں۔ فریقین کی سرزمین میں، کھلے سمندر میں اور اس علاقے میں جو کسی بھی مملکت کے ملکیت میں نہ ہو، جنگ کی جا سکتی ہے۔ لیکن حربیوں کو چاہیئے کہ غیر جانب دار مملکت کے علاقے کا احترام کریں خواہ وہ خشکی ہو یا تری۔ چنانچہ غنیم کا تعاقب کھلے سمندر میں شروع کیا جائے اور وہ غیر جانب دار پانی میں پہنچ جائے تو وہاں لڑائی اور گرفتاری کی اجازت نہیں ہوگی۔ غرض غیر جانبدار علاقے میں نہ تو کسی جنگی کارروائی کی ابتدا ہو اور نہ انتہا۔

ف ۱۵۰ (۲) لاسلکی کی ترقی سے بحری تاروں کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ چونکہ غیر جانب دار ملک کی بحری تاروں سے جو کھلے سمندر میں سے گزریں، حربیوں کو نامہ و پیام میں مدد ملتی ہے، اس لئے غنیم کو اس سے محروم کر دینے کی کوشش کا باعث سمجھ میں آ سکتا ہے۔ بحری تاروں کی چار صورتیں ہیں:۔

ا۔ جب وہ کسی حربی ملک کے دو حصوں کو ملاتی ہو۔ غنیم ان کو بے تکلف تباہ کر سکتا ہے۔ اور خبر رسانی پر اور طور

سے نگرانی (سنسر) قایم کر سکتا ہے۔

ب۔ جب وہ ان دو ملکوں کو ملاتی ہو جن میں اب جنگ چھڑی ہے۔ فریقین اس کو کاٹ بھی سکتے ہیں اور باہمی رضامندی سے کوئی اور انتظام بھی روا رکھ سکتے ہیں۔

ج۔ ایک غنیم کے ملک سے کسی غیر جانب دار ملک کو ملاتی ہو۔ اگر دوسرا غنیم ان کو کاٹ ڈالے تو غیر جانب دار ملک کو ہرجہ پانے کا حق پیدا ہوتا ہے لیکن اس قسم کے متعلق یکساں رواج پیدا نہیں ہو سکا۔

د۔ دو غیر جانب داروں کے ملک کو ملاتی ہو۔ عموماً اس کو کاٹنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ملتی۔

بہرحال جیسا کہ عرض ہوا، لاسلکی کی بڑھتی ہوئی ترقی سے بحری تاروں کی اہمیت گھٹتی جا رہی ہے۔

۱۵۱ (۳) حربیوں کا تیسرا فریضہ یہ ہے کہ غیر جانبدار علاقے میں جنگی تیاریاں نہ کرے۔ رنگروٹوں کی بھرتی، فریقین جنگ کے جنگی جہازوں کا ہتھیار حاصل کرنا، فوجی مہموں کو تیار کرنا، اور غنیم کی تاک میں رہنا ——— ان سب کی ممانعت ہے۔ بعض معاہدوں میں یہ طے ہوا ہے کہ غیر جانب دار علاقے کو مستقر کارروائی جنگ (بیس آف آپریشن) بنانا اور وہاں

"جنگجویانہ مہم" (وار لائیک اکس پڈیشن) کی تیاری کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ان اصطلاحوں کے معنے نہیں بتائے گئے ہیں لارنس کی رائے میں اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ جن کاموں کو تھوڑی مقدار اور تھوڑے عرصے کے لئے کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا جا سکے، لیکن زیادہ مقدار یا زیادہ عرصے کے لئے کرنے میں کسی حربی کو اپنے غنیم پر بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے، ایسے کاموں کو اپنے علاقے میں کرنے دینا "مستقر کارروائی جنگ" بنتا ہے مثلاً کسی جنگی جہاز کا کثیر مرمت یا آرام کے لئے آنا یا بحری غنیمت کو لا رکھنا تاکہ غنیم دوبارہ ان کو چھین نہ سکے، اسی میں داخل ہیں جنگجویانہ مہم کے معنے یہ لئے جاتے ہیں کہ سپاہیوں کا افسر کی سرکردگی میں لڑائی میں حصہ لینے کے لئے ایک تنظیم کے ساتھ جانا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس میں جنگ چھڑی تو نیو یارک سے دو فرانسیسی جہازوں میں بارہ سو فرانسیسی روانہ ہوئے جہازوں میں کچھ سامان جنگ اور بندوقیں بھی تھیں۔ مگر چونکہ ان فرانسیسیوں کے نہ تو کوئی افسر تھے اور نہ ان میں کوئی فوجی تنظیم تھی اس لئے اس روانگی کو جنگجویانہ مہم نہیں سمجھا گیا۔

ف ۱۵۲ اگر غیر جانب دار ملک اپنی غیر جانب داری کی حفاظت کے لئے کوئی قاعدہ نافذ کرے تو حربیوں کو چاہئے

کہ ان کی تعمیل کریں۔ مثلاً جنگی جہاز غیر جانب دار بندرگاہ میں کتنی دیر ٹھہر سکتے ہیں، کتنا کوئلہ اور ما یحتاج (غذا و غلہ) لے سکتے ہیں، کتنی مرمت کرا سکتے ہیں وغیرہ۔ غیر جانب دار خشکی میں حربی سپاہیوں کو آنے یا گزرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ورنہ انہیں نظر بندی سے سابقہ پڑتا ہے۔ صرف بیماروں اور زخمیوں کے ساتھ رعایت کی جا سکتی ہے۔

بڑی جنگ کے آخر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ عارضی صلح کے دوران میں جرمن فوجوں کو حربی علاقوں کا تخلیہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ستر ہزار جرمن فوج بلجیم سے واپسی میں ہالینڈ کی راہ گزرنا چاہتی تھی۔ ہالینڈ (غیر جانب دار) میں ان کو روکنے کی قوت نہ تھی۔ ان کو نظر بند کرنا اس وجہ سے ممکن نہ تھا کہ ملک میں غذا کی بڑی قلت تھی۔ چونکہ جنگ ختم ہو رہی تھی، اس لیئے نہتا کر کے ان کے گزارنے پر متحدین چپ ہو گئے۔

ف ۱۵۳ اگر کسی ملک کی غیر جانب داری کی حربیوں کے کسی فعل سے خلاف ورزی ہو تو حربی ہرجہ دیں اور تلافی کریں بعض وقت کسی چیز کی بجنسہ واپسی، بعض وقت واپسی مع ہرجہ اور بعض وقت محض معذرت عمل آتی ہے۔ اسی سلسلے میں اس غصب اور بیگاری کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو قرون متوسطہ میں

یورپ میں پیدا ہوا اور اب تک باقی ہے۔ اس جاہلانہ رسم کا (جسے انگاری کا نام دیا گیا ہے) مطلب یہ ہے کہ اگر جنگ کے زمانے میں سخت ضرورت محسوس ہو تو غیر جانب دار کی جائداد اور رعایا سے جو کسی حربی کے علاقے (یا عدالتی اقتدار) میں ہوں جبری استفادہ اور بیگاری لی جا سکتی ہے، خواہ یہ جائداد سرکاری ہو یا خانگی۔ البتہ معاوضہ دیا جانا چاہیئے۔ جنگ عظیم کے موقع پر انگریزوں نے غیر جانب دار ترکی کے زیر تعمیر جنگی جہاز اسی طرح ضبط کر لئے اور ہالینڈ اور سویڈن کے تجارتی جہازوں کو بیگاری کے لئے روک لیا تھا۔

غیر جانبدار مملکت کے فرائض

دفعہ ۱۵۲ بعض امور کی حد تک عام اتفاق ہے اور بعض کے متعلق عمل میں اختلاف ہے۔ حربیوں سے برتاؤ میں غیر جانب دار مملکت کو پانچ طرح سے رہنا پڑتا ہے:۔

۱۔ بعض باتوں سے رکنا۔

۲۔ بعض باتوں سے روکنا۔

۳۔ بعض باتوں کو گوارا کرنا۔

۴۔ بعض باتوں کو بحال کرنا۔ (سابقہ حالت پر رتو مظالم کے ذریعے)

۵۔ بعض باتوں کا ہرجہ دینا۔

ف ١٥٥ پہلی قسم کے سلسلے میں فریقین جنگ کو ہتھیاروں اور جنگی جہازوں سے مدد دینا، معرکہ آرائیوں سے متعلق صرف ایک فریق جنگ سے خاص مراعات ملحوظ رکھنا، کسی بھی فریق کو رقم چندے میں یا قرض دینا یا قرض کا کفیل بننا ممنوع ہیں، لیکن غیر جانب دار خانگی رعایا پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ چنانچہ ١٩١١ء کی جنگ طرابلس میں ترکی حکومت جرمنی سے ہتھیار خریدتی رہی اور ١٩١٢ء کی جنگ بلقان میں ترکی اور اس کے حریف ہر دو حربی فریق جرمنی اور آسٹریا کی منڈیوں سے ہتھیار پاتے رہے۔ ١٩١٥ء میں غیر جانب دار امریکا سے (لارنس کے بیان کے مطابق) متحدین نے نو مہینوں میں معمول سے تین کروڑ بیس لاکھ پونڈ زیادہ کے ہتھیار خریدے۔ غیر جانب دار حکومت بطور خود البتہ چاہے تو اپنی رعایا کو روکنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اسی طرح حالیہ جنگ حبشہ و اٹلی میں جب اٹلی کو مجلس اقوام نے ظالم قرار دیدیا تو مجلس اقوام نے اپنے ارکان کو حکم دیا کہ اٹلی کو ہتھیار نہ بھیجیں اور صرف حبشہ کو بھیجیں۔ البتہ طبی امداد کے لئے ہلال احمر یا صلیب احمر وغیرہ کے دستوں کا رضاکارانہ بھیجنا جانب داری نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح دستور مجلس اقوام کی ف ١٦ کے تحت ظالم حربی کا معاشی مقاطعہ کرنا بھی ١٩٣٦ء میں حبشی جنگ کے سلسلے میں پہلی مرتبہ اور ایک محدود

حد تک عمل میں لایا گیا گوہنگری اور البانیا نے باوجود مجلس اقوام کی رکنیت کے اٹلی سے ان کے تجارتی تعلقات کی مخصوص نوعیت سے مجبور ہو کر اس بائیکاٹ میں شرکت سے انکار کیا۔ مجلس اقوام کے غیر رکن ممالک میں مصر نے انگریزی اثر سے مقاطعے میں شرکت کی جس کے باعث اسے اٹلی کی کافی مخالفت مول لینی پڑی۔ غیر جانبدار کے لئے کسی حربی سے دوران جنگ میں اس کا مال غنیمت خریدنا بھی ممنوع ہے۔

ف ۱۵۶ جن چیزوں سے روکنا غیر جانبدار کا فریضہ ہے ان میں بڑی حد تک وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن سے رکنا حربیوں کا فریضہ ہے۔ ان باتوں کو روکنے میں قوت کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ غیر جانبدار ملک اپنے علاقے میں حربیوں کو (یا حربیوں کے لئے) فوجی مہموں کی تیاری سے روکنے کا پابند ہے خواہ اس طرح کی فوجی تنظیم خانگی اشخاص ہی کیوں نہ کریں۔ حربیوں کے جنگی جہازوں کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت نہ دینا ہی ایک معقول اور قابل عمل طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ جنگی تیاریوں میں رنگروٹوں اور رضاکاروں کا بھرتی کرنا بھی شامل ہے۔ رعایا کے بلا تنظیم اپنے طور پر کسی حربی کی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے جانے کی البتہ ممانعت نہیں ہے۔

اسپین کی موجودہ خانہ جنگی میں روس، اٹلی، جرمنی، آئرلینڈ وغیرہ سے رضاکار کسی نہ کسی فریق کی طرف سے بھرتی ہونے کے لئے جس کثرت سے آرہے ہیں ان سے اخبار بھرے رہتے ہیں۔ غیر جانب دار کو چاہئے کہ کسی حربی جنگی جہاز یا مال غنیمت کو زیادہ عرصے اپنی بندرگاہ میں رہنے نہ دے اور نہ اُن کی ایسی مرمت کی اجازت دے جن سے ان جہازوں کی جنگی قوت میں اضافہ ہو جائے اور نہ ہی ان جہازوں کو بار بار اور کثرت سے (خواہ مختصر عرصے کے لئے) اپنے ہاں آنے اور غیر جنگی سامان (مثلاً کوئلہ یا غذا وغیرہ) لیجانے دے۔ آخر میں غیر جانبدار ملک کو چاہئے کہ اپنے علاقے میں نہ تو حربیوں کے لئے کوئی اطلاع کا مرکز قائم کرنے دے، اور نہ اپنے لاسلکی یا تار کے دفتروں سے جنگی احکام رسانی وغیرہ کا کام لینے دے ——— کم از کم ایک کو اجازت دے کر دوسرے کو محروم نہ رکھے۔

(۱۵) کسی جنگ کے زمانے میں غیر جانب دار ملکوں کے لئے جن چیزوں کو گوارا کرنا پڑتا ہے، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ کسی حربی کے ملک میں ان کی جو جائداد ہو اُسے اگر جائز جنگی کارروائیوں کے سلسلے میں ضرر پہنچے یا ان کی رعایا کو کوئی تکلیف اٹھانی پڑے یا فریقین جنگ جہازوں کی تلاشی لیں، اور غنیم کے ملک کو برآمد ہونے والے ہتھیار ضبط کریں اور غنیم کی کسی بندرگاہ

کو بند کر کے آمد و رفت کو غیر جانب داروں کے لئے بھی روک دیں تو غیر جانب دار کو چپ رہنا اور گوارا کرنا پڑتا ہے۔ جہازوں کی تلاشی سے خاص کر کافی خرچ اور نقصان ہوتا ہے۔ لیکن جب تک فریب کے امکانات انسانی سماج میں باقی رہیں گھن کے ساتھ کیڑے کو بھی پسنا پڑے گا۔ گو "بدنام کنندۂ نکونامے چند" ہی ہوتے ہیں۔

فقرہ ۱۵۱۔ سابقہ حالت پر بحال کرنے کا فریضہ اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب غیر جانب دار کے ملک میں حربی اپنے غنیم کو کچھ نقصان پہنچائے۔ مثلاً جہاز کا تعاقب کر کے گرفتار کرلے ایسی صورتوں میں غیر جانب دار کا فریضہ ہے کہ غاصب سے چھینی ہوئی چیز لے کر مغصوب منہ کو واپس دلائے۔ اگر ملزم جہاز اس کے حدود اختیار میں ہو تو اپنے حبلہ ذرائع کی مدد سے ورنہ اس کی حکومت سے سفارتی ذرائع سے اس سرزوری کی تلافی کرائے۔ ایک حربی اپنی بحری غنیمت کو موسم کی خرابی، ایندھن کی کمی، یا تباہی یا کسی اور خرابی کی وجہ سفر کے ناقابل ہو یا عدالت غنائم بحری کے فیصلہ ضبطی کا انتظار ہو تو غیر جانب دار بندرگاہ میں لاسکتا ہے۔ لیکن اگر ان وجوہات کے علاوہ کسی اور غیر معقول وجہ سے (مثلاً تعاقب سے بچنے کے لئے) لایا گیا ہو تو بھی "ردّ مظالم"

غیر جانب دار کا فریضہ ہے۔ اِس سلسلے میں غیر جانب دار ملک کا چارۂ کار ایک تو سفارتی شکایت ہے، دوسرے بزور کسی خلاف غیر جانب داری فعل کو روکنا یا ہونے پر تلافی کرنا ہے (اور انسٹی ٹیوٹ آف اِنٹرنا شنل لا کے مطابق تو غیر جانب دار ملک ملزم کا اپنے حدود کے باہر کھلے سمندر میں بھی تعاقب کر سکتا ہے)۔ تیسرا طریقہ اپنی عدالت غنایم بحری کی مدد سے ملزم جہاز سے اس کی غنیمت لے کر متنفر کو واپس دلائے۔

ف ۲۵۹ یہ بھی معقول ہے کہ اگر کسی غیر جانب دار کی غفلت یا بدخواہی کی وجہ سے کسی حربی کو نقصان پہنچے تو اس غیر جانبدار کو ہرجہ دینے کا پابند کیا جائے۔ غفلت کے سلسلے میں سنہ ۱۸۶۲ء کا الاباما کا مقدمہ قابل ذکر ہے۔ امریکی خانہ جنگی کے زمانے میں ممالک متحدہ امریکا کی حکومت نے انگلستان کی حکومت کی توجہ اس جانب منعطف کرائی کہ باغیوں کے لئے ایک جنگی نوعیت کا جہاز ـــــ جس کا نام بعد میں الاباما رکھا گیا ـــــ بن رہا ہے۔ الاباما انگلستان سے بالکل غیر جنگی حالت میں گیا لیکن بحر ظلمات (اٹلانٹک) کے وسط میں جزائر آزور پہنچا تو انگلستان سے تین جہاز جنگی سامان لے کر آئے اور الاباما لیس ہو کر ممالک متحدہ امریکا کے تجارتی جہازوں پر چھاپہ مارنے لگا۔

کئی سال کی بحث پر انگلستان اور ممالک متحدہ تحکیم پر آمادہ ہوئے۔ اور ۱۸۷۲ء میں حکموں نے جنیوا میں فیصلہ کیا کہ انگلستان اپنی نامناسب غفلت کی پاداش میں ممالک متحدہ امریکا کو تیئیس لاکھ پونڈ ہرجہ دے۔

غیر جانبدار کی تجارت

۱۶۰۔ اس باب کا زیادہ تر تعلق حربی ملک اور غیر جانب دار خانگی افراد کے باہمی برتاؤ سے ہے۔

پرانے زمانے میں یوروپ میں قاعدہ رہا ہے کہ فریقین جنگ میں سے ہر ایک اپنے حریف کو نقصان پہنچانے کے لئے غیر جانبدار ملک کی تجارت کو بھی حریف کے ملک سے جبراً بند کر دے۔ بیوپار کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور ملکوں کے باہمی احتیاج نے اس سختی کو گھٹانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ یہ تو ابھی ممکن نہیں ہے کہ کسی جنگ میں غیر جانب دار ممالک حربیوں سے اسی طرح کاروبار کرتے رہیں جس طرح حالت امن میں۔ پھر بھی اس کے ساتھ وہ سختی روا نہیں رکھی جا سکتی جو پہلے ممکن تھی۔

خشکی کی تجارت میں زیادہ پیچیدگی نہیں ہے۔ غنیم کے علاقے

میں غیر جانبدار باشندوں کے مال تجارت سے سامان اور رقم مہیا کرنے کا مطالبہ فاتح افسر اسی طرح کرسکتا ہے جس طرح وہ ملک کے اصلی باشندوں سے۔

بحری تجارت میں زیادہ پیچیدگی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جہاز ایک ملک کا ہو، اسباب اور بار دوسرے ملک کا اور اس کا بیمہ تیسرے ہی ملک میں کرایا گیا ہو۔ اس طرح ایک ہی بڑے جہاز میں بیسیوں ملکوں کا مال ہو۔

یہ تو قدیم ہی سے قاعدہ بنا چلا آرہا ہے کہ غیر جانب دار ملک کسی فریق جنگ کو کچھ جنگی سامان بیچے ——— صرف بیچنا ممنوع نہیں ہے ——— تو دوسرا فریق جنگ آڑے آ کر اس سامان کو چھین سکتا ہے۔ غیر جنگی سامان کی تجارت کرنے اور بھیجنے کی سختیاں گھٹتی جا رہی ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی معینہ قاعدہ نہیں بن سکا ہے۔

قرون متوسط کا جو رواج سنہ ۱۴۹۴ء میں چھپے ہوئے کونسولاتو دل مارے میں درج ہے، وہ یہ ہے کہ دشمن جہاز میں غیر جانبدار مال مامون رہے اور غیر جانبدار جہاز سے دشمن کا مال چھین لیا جا سکتا تھا۔

ہالینڈ کی بحری برتری کے زمانے میں یہ قاعدہ پیش کیا گیا کہ مامون جہاز کا بار بھی مامون اور دشمن جہاز کا بار بھی دشمن ہی کا سا سمجھا جائے۔

فرانسیسی نظریہ یہ رہا ہے کہ غیر جانب دار مال دشمن کے جہاز

ہیں اور دشمن کا مال غیر جانب دار کے جہاز میں بھی قابل ضبطی ہیں نیز غیر جانب دار جہاز بھی ضبط کیا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۸۵۶ء کے اعلان پارس کے ذریعے جو معاہدہ ہوا تھا وہ یہ تھا دشمن کا مال غیر جانب دار جہاز میں اور غیر جانب دار کا مال دشمن کے جہاز میں قابل ضبطی نہیں ہیں۔ بجز ممنوعہ جنگی اشیاء کے (دیکھو آئندہ ف ۱۶۷)۔

گزشتہ بڑی جنگ میں اس پر عمل جاری نہ رہ سکا اور ہر فریق نے دوسرے کی بندرگاہوں کی ناکہ بندی کر کے اور ممنوعہ اشیاء کی فہرست بڑھا کر غیر جانب دار تجارت کو بند سا کر دیا۔

قابل ضبطی غیر جانبدار جہاز

ف ۱۶۱ علاوہ محاصرہ شکنی، ممنوعہ باربرداری اور خلاف غیر جانبداری افعال کی صورتوں کے، غیر جانبدار کا جہاز چند صورتوں میں کوئی فریق جنگ ضبط کر سکتا ہے:-

(۱) وہ جہاز جن کی حفاظت ان کی حکومت خاص طور سے نہ کرے، چند صورتوں میں قابل ضبطی ہیں۔ ایک فریق جنگ کا جہاز جو اس کے نام یا خود اعلان جنگ کے بعد اثرات جنگ سے بچنے کے کسی غیر جانب دار کے نام منتقل کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ غیر جانبدار جہاز جو کسی فریق جنگ کے جھنڈے، اجازت یا سند سے سفر کرے،

نیز دوران حمل و نقل میں جو مال کوئی فریق جنگ اپنے جھنڈے کے جہاز میں کسی غیر جانبدار کے نام منتقل کر دے وہ مال بھی قابل ضبطی ہے مزید براں جو غیر جانبدار جہاز کسی حربی جنگی جہاز کی تلاشی میں آڑے آئے وہ بھی قابل ضبطی ہے۔

۴۔ سترھویں صدی کے وسط سے یہ رواج نکلا کہ کوئی غیر جانبدار ملک اپنے جنگی جہازوں کی حفاظت اور ہمراہی میں اپنے ملک کے تجارتی جہاز روانہ کرے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اکثر ممالک نے تسلیم کر لیا کہ ایسے تجارتی جہازوں کی تلاشی نہ لی جائے۔ البتہ حربی جنگی جہاز، محافظ جنگی جہاز سے ان امور کا تحریری مواد طلب کر سکتا ہے جو اسے تلاش پر معلوم ہوتے۔ اگر حربی جہاز کو شبہ ہو تو محافظ جہاز تحقیقات کرے۔ اور شبہ ٹھیک نکلے تو ایسا تجارتی جہاز حفاظت سے محروم ہو جائے گا۔ اگر حربی اور محافظ جہازوں میں اتفاق رائے نہ ہو سکے تو سفارتی شکایت کی جائے۔ سنہ ۱۹۰۹ء کے غیر موثقہ اعلان لنڈن کا یہ قاعدہ ایک حد تک اب بھی زیر عمل ہے۔

غیر جانبدار جنگی جہاز کسی حربی کے تجارتی جہاز کے لئے محافظ دستے اور حفاظت کا کام انجام دینے کے مجاز نہیں۔ اسی طرح غیر جانبدار تجارتی جہاز کا کسی حربی کے جنگی جہاز کی پناہ میں سفر کرنا جانبداری سمجھا جاتا ہے اور وہ موقع ملنے اور گرفتار ہونے پر قابل ضبطی ہو جاتا ہے۔

بحری ناکہ بندی

۱۶۲ ہر حربی مملکت کو حق ہوتا ہے کہ اپنے غنیم کی بندرگاہوں
کو ہر کسی کا آنا جانا بند کر کے غنیم پر دباؤ ڈالے اس کے لئے بندرگاہوں
کے قریب جنگی جہاز بھیج کر خلاف ورزی کی روک تھام کی جاتی ہے۔
۱۹۱۴ء کی بڑی جنگ میں جرمنی نے آبدوز کشتیوں کی مدد سے
انگلستان کا محاصرہ کیا تھا۔ اور محاصرہ شکنی کرنے والے غیر جانبدار
جہازوں کو بھی ڈبونا شروع کیا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی عدالتیں
اسے ناجائز قرار دیتے ہیں کیونکہ کھلے سمندر کے بڑے رقبوں کو جرمنی
نے دائرہ جنگ قرار دیا تھا۔ ہمارے خیال میں ایسا دائرہ [illegible]
کی قوت کے لحاظ سے تنگ اور پھیلا ہوا ہو سکتا ہے۔ کمزور [illegible]
سے تو ان روک سکتا ہے۔

بحری ناکہ بندی کے لئے واقعی طور سے جہاز بھیجنا اور غیر جانبدار
ممالک کو اس واقعے سے باخبر کرنا ضروری ہے۔ کاغذی ناکہ بندی کے
اعلان کی غیر جانبدار ممالک خلاف ورزی کریں تو ان سے بدلہ
نہیں لیا جا سکتا۔

ناکہ بندی کرنے میں اتنی قوت لا کھڑی کرنی چاہئے جو [illegible]
کو [illegible] روک سکے۔ اور اعلان میں ناکہ بندی کے حدود اور تاریخ آغاز

کی تفصیل بھی ہونی ضروری ہے۔ نیز یہ بھی کہ کسی محصور بندرگاہ میں جو غیر جانبدار جہاز فی الوقت موجود ہوں وہ کتنی مدت میں واپس جا سکتے ہیں۔ بحری ناکہ بندی صرف غنیم کی بندرگاہوں کی ہوتی ہے نہ خود اپنی بندرگاہوں میں عام آمد و رفت بند کرنے کا اعلان بحری ناکہ بندی نہیں ہے۔ باغی علاقہ جنگی اغراض کے لیے اپنا نہیں بلکہ اجنبی غنیم کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔

ف ۱۶۲ محاصرے جنگی بھی ہوتے ہیں، تجارتی یا معاشی بھی۔ جنگی ناکہ بندی میں محصور بندرگاہوں کو مسخر کرنا یا وہاں غنیم کے جنگی جہازوں کو بند رکھنا پیش نظر ہوتا ہے۔ اور تجارتی یا معاشی ناکہ بندی سے غنیم کی خارجہ تجارت کو روک کر اس کے ذرائع کا گھٹانا مقصود ہوتا ہے ——— اگرچہ غیر جانبدار ممالک اس آخری قسم کو ناپسند کرتے ہیں مگر رواج اس کو جائز بتاتا ہے۔

ف ۱۶۳ محاصرہ شکنی یعنی ناکہ بندی کی پرواہ نہ کرکے آنا یا جانا عموماً ملزم کے جہاز اور بار کو ضبطی کا مستوجب بنا دیتا ہے۔ البتہ اگر اسباب کا مالک یہ ثابت کرے کہ اسے اسباب کے بار کرتے وقت جہاز والوں کے ارادۂ محاصرہ شکنی کا کوئی علم نہ تھا، تو پھر اسباب واگزاشت اور صرف جہاز ضبط کیا جاتا ہے۔ ضبطی عدالت غنائم بحری کے حکم سے ہوتی ہے۔ اگر خاص حالات میں ایسے جہاز کو تباہ بھی کیا جائے تو ملاحوں اور کاغذا

جہاز کا بچانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

ف ۱۶۵ ناکہ بندی میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ غیر جانبدار کی بندرگاہوں کا راستہ بند نہ ہو جائے لیکن بعض صورتوں میں جغرافی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی مثلاً جنگ عظیم میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے دردانیل کا محاصرہ کر لیا تھا۔ دردانیل بحر اسود کا راستہ ہے۔ اگر بحر اسود کی کوئی ساحلی مملکت جنگ میں غیر جانب دار رہتی تو پیچیدگی پیدا ہوتی۔

ف ۱۶۶ ناکہ بندی کے دوران میں کسی طوفان وغیرہ سے مجبور ہو کر کوئی غیر جانب دار جہاز محصور بندرگاہ میں صرف عارضی پناہ لینے کے لئے جانا چاہتا ہو تو محاصرہ کنندہ اپنا اطمینان کر کے اجازت دے سکتا ہے۔

ممنوعہ تجارت

ف ۱۶۷ ہر فریق جنگ کو یہ حق ہوتا سمجھا جاتا ہے کہ وہ غنیم کو ایسی چیزیں بھیجنے دینے میں آڑے آئے جن سے غنیم کو جنگ اور لڑائی میں مدد ملے۔ اس حق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ممنوعہ اسباب چاہے غیر جانب دار ہی غنیم کے ملک کو لیجائے چھین لیا جا سکتا ہے۔ غیر جانب دار تاجروں کو کسی حربی کے ہاتھ ممنوعہ اسباب،

اسلحہ وغیرہ بھیجنے میں آزاد ہیں۔ صرف اس اسباب کو کسی حربی کے علاقے تک خاص کر بحری ذرائع سے لے جائیں تو چھن جانے کے جوکھم کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ غرض :-

(۱) ممنوعہ اسباب بیچنا نہیں بلکہ لیجانا جرم ہے۔

(۲) منزل مقصود راست ہو یا بالواسطہ، اگر کسی حربی کا علاقہ ہے تو ممنوعات کی حمل و نقل جرم ہے۔

(۳) ممنوعہ اسباب جوں ہی ممنوع منزل مقصود کے لئے اپنی بندرگاہ سے نکلے، جرم مکمل ہو جاتا ہے۔ اور اسباب اتار دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس فعل کی بنا پر سزا نہیں دی جا سکتی۔

ف ۱۶۸ تجارتی اسباب کی تین قسمیں کی جاتی رہی ہیں۔ خالص جنگی، خالص غیر جنگی اور مشترک یعنی جو جنگی اور غیر جنگی دونوں ضرورتوں میں کام آتا ہو۔

خالص جنگی سامان کا لیجانا مطلقاً ممنوع ہے۔ خالص غیر جنگی سامان اگر غیر جانبدار کسی حربی کے ملک کو لیجائے تو دوسرا حربی آڑے نہیں آتا۔ مشترک قسم کا اسباب اگر کسی حربی کی فوج یا سرکاری دفتر کے نام جا رہا ہو تو چھین لیا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ اس کی ممانعت مشروط ہے۔

خالص جنگی سامان میں پہلے صرف اسلحہ اور گولہ بارود داخل تھے

لیکن اب اس فہرست میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے، اور ہر حربی اس کا حق رکھتا ہے کہ جس چیز کو چاہے اس فہرست میں داخل ہونے کا اعلان کرے۔ ۱۹۰۹ء کے غیر موثقہ اعلان لنڈن میں دو سو چیزیں خالص جنگی سامان کی فہرست میں داخل کی گئی تھیں اور بڑی جنگ میں یہ فہرست ناکافی سمجھی گئی۔ علاوہ بریں عام جبری فوجی تعلیم کے باعث چونکہ آبادی کا بہت بڑا حصہ جنگی حیثیت رکھتا اور مقاتل سمجھا جاتا ہے، اس لئے اُن کی بسر برد کی ہر چیز ممنوعہ فہرست میں داخل کی جا سکتی ہے۔ ——— نہ معلوم بنی نوع انسان کی یہ برداشت کب تک جاری رہیگی؟

۱۶۹ اسی سلسلہ میں "مسلسل سفر" کا نظریہ بھی واضح کر دیا جا سکتا ہے۔ اگر ممنوعہ اسباب ایک غیر جانبدار ملک سے دوسرے غیر جانبدار ملک کو جائے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے اگر یہ دوسرا غیر جانبدار ملک اسے کسی حربی کو بھیج رہا ہو تو یہ ممنوعہ اسباب کا "مسلسل سفر" سمجھا جاتا ہے اور ظاہری غیر جانبدار منزل مقصود کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ وہ قابل ضبطی ہوتا ہے۔ کوئی سفر سلسلہ بہ سلسلہ ممنوع مقام تک جاتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عدالت غنائم بحری کرتی ہے۔

۱۷۰ ممنوعہ اسباب لیجانے کی سزا یہ ہے کہ اسباب ضبط

کرلیا جاتا ہے، اور جہاز بھی اگر ممنوعہ اسباب جہاز کے بار کا بالیت، وزن، حجم، یا کرائے میں آدھے سے زائد ہو۔ ممنوعہ اسباب کے مالک کا غیر ممنوعہ اسباب بھی اگر اسی جہاز میں ہو تو اسے بھی ضبط کر لیا جاتا ہے۔

جنگ چھڑنے کا علم نہ ہو اور ممنوعہ اسباب بھیج دیا جائے یا کسی اسباب کے ممنوع ہونے کا علم نہیں ممانعت کی بناء پر نہ ہو سکا ہو تو غیر جانبدار مالک کو معاوضہ دے کر مال ضبط کرنا چاہیئے۔

جانبداری یا خلاف غیر جانبداری خدمات

ف ۱۷۱ بہت سی باتیں ہیں جو گو لڑائی میں عملی حصہ لینا نہیں سمجھی جاتیں لیکن وہ تجارتی کاروبار سے بڑھ کر جنگی خدمات کی نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ غیر جانبدار کو ایسی خدمتیں انجام دینے کی ممانعت ہے۔

ف ۱۷۲ ممنوعہ اسباب لیجانے اور خلاف غیر جانبدار خدمت انجام دینے میں فرق ہے:-

(۱)۔ ممنوعہ اسباب لیجانے کا بڑا مقصد تجارت ہوتا ہے، خلاف غیر جانبداری خدمت میں تجارتی سے زیادہ جنگی نوعیت ہوتی ہے۔

(۲) ممنوعہ اسباب اگر کسی حربی کو جا رہا ہو تو قابل ضبطی ہے خلاف غیر جانب داری خدمت میں منزل مقصود کو کوئی اہمیت نہیں۔

(۳)۔ ممنوعہ اسباب لیجانے میں ضبطی کا اثر سب سے پہلے خود اسباب پر ہوتا ہے۔ اور جہاز پر بعد میں اثر پڑتا ہے۔ خلاف غیر جانب داری خدمت میں جہاز پہلے گرفت میں آتا ہے۔ اور اسباب کی ضبطی صرف چند خاص صورتوں میں ہو سکتی ہے۔

دفعہ ۱۶۴۔ خلاف غیر جانب داری خدمات کا کوئی معین ضابطہ نہیں ہے اس میں عام طور سے یہ دو کارروائیاں ہوتی ہیں:۔

(۱)۔ پہلے جب غیر جانب دار کا وہ مجرم جہاز اور اس کا اسباب تو ضبط ہوتا ہے لیکن جہاز کی حیثیت اس غیر جانب دار جہاز کی ہوتی ہے جو ممنوعہ اسباب لیجا رہا ہو۔ چنانچہ کسی حربی کی فوج کے سپاہیوں کا حمل و نقل، معلومات اور اطلاعات کا کسی حربی کے لئے لیجانا، ان مسافروں اور دستاویزوں کو تو قابل ضبطی بنا دیتا ہے اور جہاز کو بھی لیکن جہاز کا دوسرا سامان محفوظ رہتا ہے، سوائے اس سامان کے جو ضبط شدنی اسباب کے مالک کا ہو۔

نیز ایسے جہاز کو اس وقت تک ڈبویا یا تباہ کیا نہیں جا سکتا جب تک کہ سخت جنگی ضرورت نہ ہو۔ اور اس کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔

(۲) دوسرے جب غیر جانب دار کا یہ مجرم جہاز اور اس کا اسباب ضبط ہو کر جہاز غنیم کے تجارتی جہاز کی نوعیت اختیار کر لیتا ہے چنانچہ لڑائی میں براست حصہ لینا (مثلاً غنیم کے جہازوں کی سمندر میں مرمت یا غنیم کے راستوں کی بحری سرنگوں کو ڈھونڈھنا اور ان کو ہٹانا وغیرہ) غنیم کی حکومت کے مقرر کردہ کارندے کو جہاز میں لے کر اس کے احکام یا نگرانی میں سفر کرنا، خدمت خالص غنیم ہی کی کرنا، سوائے غنیم کی فوج یا خبروں کو لانے لیجانے کے اور کوئی کام نہ کرنا ——— ایسی صورتوں میں جہاز و اسباب کو نہ صرف ضبط کیا جا سکتا ہے، بلکہ ضرورت ہو تو بلا معاوضہ اسے سمندر میں ڈبو بھی دیا جا سکتا ہے۔

تمت

یہ چند صفحے جلدی میں پچیس تیس دن کے قلیل عرصے میں لکھے گئے ہیں
جن کے مواد کی ترتیب اور کیفیت بھی، فرصت ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتی۔

آخر میں میں اپنے محترم استاد (اور حال صدر شعبہ)
پروفیسر حسین علی مرزا صاحب کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں
جن کی کوشش سے "قانون بین الممالک" کا مضمون
جامعۂ عثمانیہ کے نصاب میں شامل ہوا
اور جنھوں نے مجھ میں اس کا ذوق اور
چسکا پیدا کیا گو بیانات کی ذمہ داری
خالصۃً مجھ پر ہے۔ تمنا ہے کہ خدا ہمارے
ملک کو بھی ان قاعدوں کو برتنے
کی عزت عطا فرمائے اور اہل علم
سے درخواست ہے کہ
اس نقش اولیں کو
نظر انداز کرکے اس موضوع پر بہتر سے بہتر کتابیں لکھیں اور ملک اور زبان کی
خدمت فرمائیں فقط

محمد حمید اللہ

خانۂ خلیل کٹل منڈی
(حیدرآباد دکن)

ابجدی فہرست مواد

حوالے

(چند متعلقہ اہم کتابیں)

۱۔ جیمس براؤن اسکاٹ ۔ کیسس آن انٹرنا شنل لا (۱۹۲۲ء)۔

۲۔ آسن پالاسیوس۔ اسلامی ادبیات کا اثر دانتے کی ڈفاین کامیڈی پر باب چہارم "یوروپ پر اسلامی اثرات" (مجلۂ مکتبۂ حیدرآباد دکن ماہ مئی ۱۹۳۱ء)

۳۔ آماری (فرانسیسی ترجمہ) دُروا ایں تر نا سیونال ۔

۴۔ امیر علی ۔ اسٹارٹ ہسٹری آف سارا سینز

۵۔ اوپن ہائم۔ انٹرنا شنل لا (دو جلد، طبع چہارم ۱۹۲۸ء) ۔

۶۔ بار بیراک ۔ اِستوار دے تراں سیاق تر ے تے ۔

۷۔ پاسکال۔ دِیرتو اِنتر تا ذِیونالے پوبلیکو ۔

۸۔ محمد حمید اللہ ڈوکوماں سور لا ڈپلوماسی مسلمان (دو جلد، پارس) ۱۹۳۵ء

۹۔ ایضاً۔ دی نا ٹے ترالیتیت اِم اسلامشن فوئل کر بیشت مطبوعہ رسالہ زیڈ ڈی ام جی جلد ۸۹) ۔

۱۰۔ فلیپسن ۔ انٹرنا شنل لا اینڈ کسٹم آف انشنٹ گریس اینڈ روم (دو جلد ۱۹۱۱ء) ۔

۱۱۔ فنک ۔ انٹرنا نشنل لا (نیویارک ۱۹۲۴ء) ۔
۱۲۔ فوشی ۔ ترے تے دُورُوا ایں ترنا سیونال پوب لیک (طبع ہشتم ۱۹۲۲ء)
۱۳۔ فِسوا ناتھا ۔ انٹرنا نشنل لا ان انشنٹ انڈیا (۱۹۲۵ء) ۔
۱۴۔ لارنس ۔ پرنسپلز آف انٹرنا نشنل لا (طبع ہفتم ۱۹۲۶ء) ۔
۱۵۔ لیمون لیتھی ۔ انٹرنا نشنل لا ۔
۱۶۔ نیس ۔ ایدتیرین دِ دُروا ایں ترنا سیونال (۱۸۹۴ء)
۱۷۔ ڈاکٹر واجد خاں ۔ فینانشل پرابلمس آف انڈین اسٹیٹس انڈر فیڈریشن (۱۹۳۵ء) ۔
۱۸۔ واکر ۔ اے ہسٹری آف دی لا آف نیشنز (۱۸۹۹ء) ۔
۱۹۔ وِلسن (مع) ٹکر ۔ انٹرنا نشنل لا (طبع ہشتم ۱۹۲۲ء) ۔
۲۰۔ ویسٹ لیک ۔ پبلک انٹرنا نشنل لا (دو جلد ۱۹۱۳ء) ۔
۲۱۔ ایضاً ۔ کلکٹڈ پیپرس آن پبلک انٹرنا نشنل لا (۱۹۱۴ء)
۲۲۔ ٹائلنڈ ۔ اسٹڈیز ان انٹرنا نشنل لا (۱۸۹۸ء) ۔
۲۳۔ ہولٹسن ڈورف ۔ ہانڈ بوخ دس فوئل کر رِیشٹس (چار جلد ۱۸۸۹ء) ۔
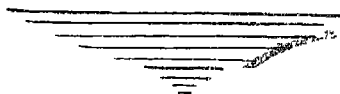
SALTANATON KE BAHAMI BARTAW
KA
DASTURUL-'AMAL

being a treatise on

Principles & Practice of Public International Law

(in Hindustani language)

BY

MUHAMMAD HAMIDULLAH,

M. A., LL. B. (Osm.); Dr. Phil. (Bonn.);

Dr.-ès-Lettres de l'Univ. de Paris; etc.

Lecturer on International Law, Osmania University.

Author of "Documents sur la Diplomatie musulmane"
"Die Neutralität im islamischen Völkerrecht",
"Romi awr Islami Idara-e-ghulami", etc., etc.

Printers & publishers

MAKTABA IBRAHIMIYA, HYDERABAD-DECCAN.

1355 A. H. = 1937 A. C.